حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات سے باقاعدہ منظور شدہ
ماہنامہ آبِ حیات لاہور
جلد ۲۰ شمارہ ۷ جولائی ۲۰۲۰ء
زیرِ نگرانی
حضرت مولانا قاری عبدالسلام حدوٹی عباسی
مہتمم دارالقرآن جامعہ آن علیوٹ مری
مدیر اعلیٰ
مولانا محمود الرشید حدوٹی عباسی
خلیفہ مجاز
شاہ ڈاکٹر عبدالمقیم صاحب دامت برکاتہم
مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب
قیمت فی شمارہ 20 روپے
سالانہ 350 روپے
ملنے کا پتہ
ادارہ آبِ حیات ٹرسٹ
غوث گارڈن 2 جی ٹی روڈ مناواں لاہور کینٹ
0300-0321-9458876
Mahmoodhadoti@gmail.com

ماہ نامہ آب حیات لاہور

جولائی ۲۰۲۰ء

بابوجی حاجی شمیم صاحب کوصدمہ

گزشتہ ماہ ہمارے بہت ہی پیارے، محترم، مخدوم اور محسن جناب الحاج بابو شمیم عباسی صاحب آف لورہ ضلع ایبٹ آباد کی اھلیہ محترمہ اور برادرم محمد احسن عباسی صاحب کی والدہ ماجدہ مختصر سی بیماری کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئیں، اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ راحت نصیب فرمائے، ان کی آنے والی تمام منازل آسان کردے، لواحقین کو صبر جمیل عطافرمائے، مرحومہ انتہائی نیک، پارسا اور صوم وصلاۃ کی پابند تھیں، اللہ غریق رحمت کرے، ہم بابو جی اور ان کے خاندان کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ مولانا قاری عبدالسلام حدوٹی، محمودالرشید حدوٹی)

محمود الرشید حدوٹی عباسی

کرونانامی وائرس جس کا آغاز چین کے شہر ووہان سے ہوا تھا اب پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے، ترقی پذیر ممالک بھی کرونا کے حصار میں ہیں اور ترقی یافتہ ممالک میں تو تباہی پھیل گئی ہے، امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، برازیل سمیت دنیا کے بیشتر ممالک میں چار لاکھ سے زیادہ لوگ موت کے منہ میں جا چکے ہیں اور روزانہ جنازے اٹھ رہے ہیں، دنیا کے جس ٹی وی چینل پر نگاہ دوڑائیں تو آپ کو مرنے والوں کی یومیہ تعداد کے ساتھ کل مرنے والوں کی تعداد بھی بتائی جاتی ہے۔

دنیا میں وبائیں تو پہلے بھی آتی رہی ہیں، مگر اس شد و مد کے ساتھ ان وباؤں کا شاید عوامی سطح پر، ملکی سطح پر، قومی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر تذکرہ نہیں کیا گیا جس طرح کرونا نامی وائرس اور اس سے متاثر ہونے والے لوگوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، پوری دنیا کے ٹیلی ویژن اس طرح پہاڑوں کی طرح فکر بیان کرتے ہیں کہ گویا اب پوری دنیا میں مرنے والوں کی بازی اور ریس لگی ہوئی ہے کہ کس ملک میں مرنے والوں کی تعداد کتنی ہے اور کون سا ملک مرنے والوں میں بازی لے گیا ہے، کسی ایک ملک کا استثناء نہیں کیا جا سکتا، سب میں مرنے والوں کی تعداد بیان کرنے میں دوڑ لگی دکھائی دے رہی ہے۔

مارچ ۲۰۲۰ء میں عالمی ادارہ صحت نے خبر دار کیا تھا کہ پاکستان میں کرونا اپنا کام زیادہ دکھائے گا، یہ اعلان سن کر کچھ باخبر اور عالمی خبروں پر کان دھرنے والوں نے ہمارے حکمرانوں کو اطلاع بھی کر دی تھی کہ وہ اپنے ملک کے لوگوں کو سنبھال لیں، مگر ہمارے عقل ودانش سے عاری حکمرانوں نے اس طرف خاطر خواہ توجہ مرکوز نہیں کی، کسی صوبے میں لاک ڈاؤن کیا گیا، کسی صوبے میں شارٹ لاک ڈاؤن کیا گیا اور کسی میں سمارٹ لاک ڈاؤن کی اصطلاحات متعارف کروائی گئیں۔

خانہ سازاصطلاحات کے نام پر یہاں لوگوں کو کاروبار سے محروم رکھا گیا، لوگوں کو محنت مزدوری سے روک دیا گیا، لوگ وسط مارچ سے تاحال گھروں میں دبک کر بیٹھے ہوئے ہیں، درمیان میں لاک ڈاؤن ختم کرنے کا اعلان کیا گیا، مگر کاروباری پہیہ اس طرح نہ چل سکا جس طرح پہلے چل رہا تھا۔

عیدالفطر کے موقع پر عدالتی حکم سے دکانیں، مارکیٹیں، شاپنگ مال کھولنے کی اجازت دی گئی، جس پر گھروں میں محصور، قیدی اور لاک ڈاؤن سے متاثر ہونے والے لوگ بازاروں کی طرف بڑی تعداد میں نکلے، جس کے بعد کرونا وائرس نے زور پکڑا، اگر پہلے روزانہ ایک دولوگ دنیا سے جارہے تھے تو اب کرونا کے باعث روزانہ مرنے والوں کی تعداد ایک سو تک پہنچ چکی ہے۔

ان تین مہینوں میں کرونا سے مرنے والے لوگوں کی تعداد تین ہزار کے قریب پہنچ چکی ہے، جب کہ کرونا کے مریض ایک لاکھ سے اوپر جا چکے ہیں، کرونا وائرس سے صحت یاب ہونے والوں کی تعداد پچاس ہزار کے قریب ہے، جب کہ پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں میں ہسپتال مریضوں سے بھرے ہوئے ہیں، ہزاروں لوگ کرونا سے متاثر ہو کر اپنے گھروں میں قرنطینہ ہیں۔

ایک وفاقی وزیر نے کل ہی ایک پروگرام میں خبردار کیا کہ اگست کے مہینے میں کروناوائرس کے مریضوں کی تعداد عروج پر ہو گی، بارہ لاکھ لوگ متاثر ہو سکتے ہیں،اس اعلان ناقابل بیان کے بعد لوگوں میں پہلے سے زیادہ خوف وہراس پھیل گیا ہے،پریشانی میں اضافہ ہو گیا ہے۔

شروع شروع میں جب لاک ڈاؤن کے نام پر پاکستانی معیشت کا بیڑہ غرق کیا گیا اس وقت ایک سخت ایکشن لیا جاتا تو آج شاید ہم اس وائرس سے نجات پا چکے ہوتے، مگر ہمارے علم اور ہماری معلومات کے مطابق عالمی تھانیدار ،انسانی لاشوں کے سوداگر کبھی انسانیت کو سکھی نہیں رکھ سکیں گے،ان کے ایجنٹ پوری دنیا پر حکمران ہیں، چھوٹے چھوٹے ملکوں پر انہوں نے اپنے زر خرید غلام بٹھار کھے ہیں، جو ان کی ہاں میں ہاں،ان کی ناں میں ناں،ان کے اثباتی سر ہلانے میں یس سر کی آواز کے ساتھ جی حضوری مقصد زندگی بنائے ہوئے ہیں۔

تمام تر احتیاطی تدابیر کے ساتھ کرونا کا شور پھیل رہا ہے، حکومت نے کچھ اصول ضابطے طے کیے جن پر سب سے زیادہ عمل مسجدوں اور مدرسوں میں کیا گیا، جس کا ذکر وزیراعظم پاکستان جناب عمران خان نے بھی اپنے ایک اظہاریے میں کیا کہ مسجدوں سے کرونا نہیں پھیلا۔

چلو شکر الحمدللہ مسجدوں کی گواہی کسی نے تو دی کہ یہاں سے کرونا نہیں پھیلا،ورنہ سب سے جلی سرخی یہی لگا کر اخبارات کی زینت بنا دی جاتی کہ مسجدوں سے کرونا پھیلتا ہے، کیونکہ شہر کی مسجدوں سے قالین اٹھوا دیے گئے ہیں،وہاں چھ چھ فٹ کے فاصلے پر نمازی کھڑے کیے جارہے ہیں تاکہ قریب قریب کھڑے ہونے سے وائرس کو پھیلنے اور ایک دوسرے کو لگنے کا موقع نہ ملے، مگر بازاروں،

منڈیوں، شاپنگ مالوں، مارکیٹوں میں کوئی بھی ان احتیاطی تدابیر کو خاطر میں نہیں لارہا ہے، جس پر حکومت نے دوبارہ سمارٹ لاک ڈاؤن کااعلان کر دیا ہے اور افرا تفری کی ایک نئے فضا قائم کی جارہی ہے۔

ملک کے مختلف مقامات پر قرنطینہ سنٹرز بنائے گئے، جن میں جھوٹے اعداد وشمار کے ذریعے مریض بھرتی کیے گئے، چند دنوں میں ان قرنطینہ سنٹروں کے نام پر کروڑوں روپے پھونک ڈالے گئے، قومی خزانے کو شیر مادر کی طرح ہڑپ کیا گیا۔

قرنطینہ سنٹروں اور ملکی ہسپتالوں میں کرونا کے نام پر کیے جانے والے ایک ایک ٹیسٹ کی فیس آٹھ سے دس ہزار روپے تک وصول کی جارہی ہے، جس سے ایک غریب آدمی جیتے جی موت کے منہ میں دھکیلا جارہا ہے، پھر کئی ڈاکٹروں اور مریضوں کے کئی لواحقین کے ویڈیوز منظر عام پر آچکے ہیں کہ ہسپتالوں اور قرنطینہ سنٹروں میں زہر کے ٹیکے لگا کر لوگوں کو مارا جارہا ہے، ابھی کل ہی ایک لیڈی ڈاکٹر کا بیان آیا ہے کہ ہسپتال میں کوئی مریض کولے کر نہ جائے، میرے سامنے چھ لوگوں کو مار کر کرونا کے مریضوں کی لسٹ میں ڈال دیا گیا ہے، ان میں اپنی ماں کا ایک اکلوتا بیٹا بھی تھا۔

کچھ لوگوں کی ویڈیو منظر عام پر آئی ہے جنہوں نے اپنی ماں کو ہسپتال میں داخل کروایا، ڈاکٹروں نے انہیں تسلی بخش قرار دیا، مگر لواحقین کو تسلی کرانے کے باوجود اگلے ہی لمحے انہیں بتایا گیا کہ تمہاری ماں مر چکی ہے، یہ ویڈیو بھی سوشل میڈیا پر وائرل ہو چکی۔

پھر مال ودولت سمیٹنے اور لوٹنے کے نئے نئے طریقے متعارف کروائے جا رہے ہیں، کرونا کے مریض کے بارے بتایا جاتا ہے کہ ایک ایک دن کا ہسپتالوں میں ایک ایک لاکھ روپیہ لیا جاتا ہے، پانچ دن والے سے پانچ لاکھ، اگر مریض مر جائے تو

لاکھوں روپے لے کر میت سپرد کی جاتی ہے، یہ مظالم اور ستم ہیں جو روزانہ سننے کو ملتے ہیں۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس افراتفری اور شور شرابے کے زمانے میں جو لوگ کرونا وائرس سے متاثر ہو کر اپنے گھروں میں علاج معالجہ اور احتیاطی تدابیر اختیار کیے رہے وہ لوگ الحمد للہ پندرہ سولہ دن کے اندر اندر صحت یاب ہوتے رہے، ان لوگوں کو سلف آئسو لیشن میں یہ ریلیف ملا کہ انہیں ڈاکٹروں کے دھکے نہیں ملے، ہسپتالوں کی مہنگی فیسیں نہیں بھرنا پڑیں اور ماشاءاللہ ٹھیک بھی ہو گئے، اللہ ان سب لوگوں کو ہمیشہ ہمیشہ صحت وعافیت کے ساتھ رکھے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے، ہم بہت کمزور، نحیف و نزار لوگ ہیں، ہم اللہ کی آزمائشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ہم ایک مچھر، ایک مکھی، ایک بچھو، ایک سانپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے، مگر کرونا جیسی وباء یا وائرس جس نے پوری دنیا میں ہلچل مچا رکھی ہے، اس کے مقابلے کے لیے ہمارے حکمرانوں نے پہلا درس یہ دیا کہ کرونا سے ڈرنا نہیں لڑنا ہے، جب کہ کچھ جانکاروں نے اس اعلان اور نعرے کی مخالفت کی کہ ایسا نہیں کہنا چاہیے، کوئی وباؤں اور خدائی آزمائشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا، بات درست بھی ہے، ہمیں ہمہ وقت اللہ سے پناہ مانگنی چاہیے، ہمیں ہمہ وقت توبہ اور استغفار کرنا چاہیے کہ اللہ ہمارے گناہوں، خطاؤں، جرائم، مظالم، حق تلفیوں کو معاف فرمائے، ہمیں توفیق دے کہ ہم حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پورا کر سکیں، اللہ ہمیں توفیق دے۔ آمین یارب العالمین

خادم اسلام محمود الرشید حدوٹی عباسی

۱۶جون ۲۰۲۰ء ۲۴ شوال المکرم ۱۴۴۱ھ بروز منگل پونے ایک بجے دوپہر

بلاشبہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت موت ہے مگر اس حقیقت پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ البتہ اگر کبھی شہر خموشاں سے گزر ہو اور مکینوں کے کتبے پڑھنے کا موقع ملے تو موت کی حقیقت کے نت نئے پہلو سمجھ میں آتے ہیں۔ جب یہ احساس ہوتا ہے کہ زندگی سمیت دنیا کی ہر شے عارضی ہے تو اس احساس سے بہت سے نشے ہرن ہو جاتے ہیں، بہت سے خواب لڑکھرانے لگتے ہیں اور غور و فکر کے انداز بدلنے لگتے ہیں۔

خالق کائنات نے زندگی کو کچھ اس انداز سے تشکیل دیا ہے کہ یہ احساس یا ادراک بھی لحاتی ہوتا ہے اور پھر انسان حسب معمول دنیا کے کاموں میں اس طرح مشغول ہو جاتا ہے جیسے اسے قیامت تک زندہ رہنا ہے جیسے موت دوسروں کیلئے ہے اس کیلئے نہیں۔

اس لئے حضرت ابو بکر صدیقؓ فرمایا کرتے تھے کہ موت مانگو نہیں لیکن موت کو یاد کرتے رہو۔ انسان اسے یاد کرتا رہے تو شاید نہ تکبر، غرور اور ہوس کا شکار ہو اور نہ ہی قتل و غارت کا مرتکب، نہ زبان کی تلوار سے دوسروں کو مجروح کرے اور نہ ہی کسی کی حق تلفی کرے۔ شاید موت کو یاد کرنے کا اس لئے کہا گیا کہ اس سے ہمارے نشے ہرن ہو جاتے ہیں چاہے وہ نشہ اقتدار کا ہو، دولت یا شہرت کا ہو، جوانی کا ہو یا حسن کا.

زندگی کی کتاب میرے سامنے کھلی تھی اور میں یادوں کے البم میں تصویریں دیکھتے دیکھتے اپنے آپ میں گم تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی جسے شاید میں بیان کرنے پہ قدرت نہیں رکھتا۔ ان تصویروں میں بہت سے چہرے شناسا تھے کیونکہ کسی سے گہری دوستی رہی تھی، کوئی سروس میں ''کولیگ'' تھا، کسی سے اچھی شناسائی تھی، کسی سے سرِراہ یا کسی محفل میں ملاقات ہوئی تھی، کوئی زندگی میں شہرت و مقبولیت کے اعلیٰ ترین مقام پر جگمگاتا رہا تھا، کسی کی شاعری، کسی کی نثر، کسی کے علم، کسی کی دانشوری، کسی کی سریلی آواز، کسی کے حسن اور کسی کی عالمانہ تقاریر اور کتابوں کے چرچے چہار سُو تھے۔

کوئی بڑا صنعتکار، کوئی بڑا کھلاڑی، کوئی سیاستدان اور کوئی اپنے زمانے کا بڑا مقرر تھا لیکن آج سب کے سب منوں مٹی تلے سو رہے ہیں۔ انہیں عزیز و اقارب کندھوں پر اٹھا کر قبر میں اتار آئے تھے جہاں دولت، شہرت، علم، طاقت، اقتدار، حسن حتیٰ کہ کچھ بھی کام نہیں آتا بجز نیکی کے۔ ان کے نام بھی اس لئے مانوس ہیں کہ یہ ہمارے ہمعصر تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد زمانہ ان کے ناموں سے بھی ناآشنا ہو جائے گا۔

عجیب بات ہے کہ چند ایک حضرات جو سروس میں مجھ سے سینئر تھے مگر ان سے آشنائی تھی ان کی موت کی خبر بھی اس کتاب سے ملی۔ یہ ہے زندگی... ایک وقت ہم اکٹھے ہوتے ہیں، ہر روز ملتے ہیں لیکن پھر زندگی یوں بکھیر دیتی ہے کہ کون کب پیوندِ خاک ہوا پتا ہی نہیں چلا۔ خزاں کے موسم میں ہرے بھرے پتے زرد اور خشک ہو کر ٹہنیوں سے گرتے رہتے ہیں اور کوڑے ''شُورے'' کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی زندگی کی ٹہنیوں سے پژمردہ ہو کر گرتا اور سانس سے ناتا توڑتا رہتا ہے مگر زندگی کی حرص و ہوس اور بھاگ دوڑ میں شریک لوگوں کو خبر تک نہیں

ہوتی کہ کون کہاں گرا۔ زندگی کی بے ثباتی کی کیفیت طاری ہو تو ان فرعونوں پہ رحم آتا ہے جو اقتدار کے تخت پر بیٹھ کر یا قارون کے خزانے کو اپنے بینک اکائونٹ میں سجا کر یا اپنی شہرت اور دانشوری کے زور پر دوسروں کو لتاڑتے یا مجروح کرتے ہیں یا اس طرح بات کرتے ہیں جیسے وہ حرفِ آخر ہوں اور دنیا بھر کی دانش ان کی مرہونِ منت ہو۔ مجھے تو ان بیچاروں پر بھی ترس آتا ہے جو سرِ شام ٹی وی پر بیٹھ کر اپنے آقاؤں کے قصیدے پڑھتے اور ان کی غلط کاریوں کا دفاع کرنے کیلئے اپنی صلاحیتیں صرف کرتے ہیں، اس خدمت کے عوض زیادہ سے زیادہ کوئی سیاسی عہدہ، مالی منفعت یا شاباش مل جائے گی لیکن اس کذب بیانی سے اعمال نامہ جس طرح سیاہ ہوتا ہے اس کا انہیں احساس ہی نہیں۔

زندگی کی ایک بڑی حقیقت عشق ہے اور سچا عشق، عشق الٰہی اور عشق رسولؐ ہوتا ہے جو انسان کو زندگی اور موت دونوں میں امر بنا جاتا ہے۔ ایک عاشق رسولؐ محمد سعید بدر کا نعتیہ کلام ''عرض تمنا'' کی شکل میں ملا تو میں پیش لفظ میں ہی ڈوب کر رہ گیا۔ نعت عشق ہے اور میں اس پہ تبصرہ کرنے کا ہرگز اہل نہیں، سچ یہ ہے کہ پیش لفظ میں لکھے اس واقعے نے مجھے اپنے اندر جذب کر لیا اور میں آگے بڑھ نہ سکا۔

مصنف کی زبانی سنیے: مدینہ منورہ میں ''حاضری کیلئے مزار پُرانوار پر پہنچا تو بے پناہ رش تھا، روضہ اقدس کی تنگ گلی پر سنگدل شُرطے براجمان تھے جو روضہ اقدس کی طرف بالکل جانے ہی نہ دیتے۔ راقم معذوری کی وجہ سے وہیل چیئر پر بیٹھا تھا، مزار اقدس قریب آیا تو راقم بے اختیار عالم تصور میں کھو گیا ''یا رسول اللہ ﷺ علیک الصلوٰۃ والسلام۔ مجبور اور بے بس ہوں کیا کروں۔ اپنی بے بسی پہ بہت رونا آیا۔ اس تصور میں محو تھا کہ اچانک ایک باریش ادھیڑ عمر شخص نمودار ہوا اور اس نے مجھے

وہیل چیئر سے اترنے کا کہا، چیئر سے نیچے اترا اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، پلیز یہاں کھڑے ہو جائیں آپ کو جگہ چاہئے تھی وہ میں نے لے دی۔ اب کھڑے ہو کر جو چاہو کرو، درود شریف پڑھو یا سلام پیش کرو۔ یوں محسوس ہوا جیسے دنیا و جہاں کے خزانے مل گئے ہوں۔ گھنٹہ بھر دیوار کے ساتھ باادب کھڑا درود شریف پڑھتا رہا۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے باہر آیا تو دو چار حضرات بھاگ کر میرے پاس آئے، پوچھ رہے تھے کہ وہ آدمی کون تھا؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں اسے نہیں جانتا جانے وہ کون تھا۔ بعد میں اسے بہت ڈھونڈا لیکن کہیں نظر نہیں آیا۔

موت برحق ہے اور ہر ذی روح کا مقدر ہے اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا، سوائے سچے عشق کے۔ سچا عاشق آنکھوں سے اوجھل بھی ہو جائے تو دلوں میں عقیدت کی روشنی کے ساتھ زندہ رہتا ہے اور تا قیامت زندہ رہے گا۔ گویا وہ موت قبول کرکے موت کو شکست دے دیتا ہے۔ یہی سچے عشق کی پہچان ہے اسی لئے سچے عاشقوں کے مزار دن رات زندہ رہتے ہیں اور مسلسل یہ پیغام دیتے رہتے ہیں کہ عشق حقیقی ابدی حقیقت ہے اسے موت نہیں مار سکتی۔ (بشکریہ روزنامہ جنگ)

گناہوں کے اعذار، گناہوں سے بھی بدتر

- رشوت ------- "یہ تو تحفہ اور چائے پانی کا خرچہ ہے۔"
- موسیقی ------- "یہ تو روح کی غذا ہے۔"
- بد نظری ------- "ایک بار دیکھنا جائز ہے۔"
- غیبت ------- "میں اس کے منہ پر بھی یہ بات کہہ سکتا ہوں۔"
- سود کھانا ------- "ساری دنیا کھاتی ہے۔"
- بیہودہ ناول پڑھنا ------- "ہم کچھ سیکھنے کے لئے انہیں پڑھتے ہیں۔"
- تہمت ------- "یہ بات تو پوری دنیا کہہ رہی ہے۔"
- حرام محفل ------- "بس تھوڑی سی تفریح مقصود ہے۔"
- بے پردگی ------- "پردہ تو آنکھ کا ہوتا ہے۔"
- نماز چھوڑنا ------- "فلاں نمازی ہزار گناہ بھی کرتا ہے۔"
- شراب نوشی ------- "اللہ بڑا غفور اور رحیم ہے۔"
- شادیوں میں ناچ گانا ------- "یہ شادی ہے، کوئی فاتحہ اور جنازہ نہیں۔"
- اسراف ------- "خرچہ نہ کریں تو لوگ کیا کہیں گے۔"
- عیاشی ------- "دو دن کی زندگی ہے۔"

گناہوں کے اعذار تراشنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ قیامت کے دن گناہوں کے جھوٹے اعذار بیان کرنے والی ہماری اس زبان پر مہر لگی ہوگی اور ہاتھ پاؤں و دیگر اعضاء ہمارے اعمال کی گواہی دیں گے۔

عالمی مبلغ اسلام حضرت مولانا طارق جمیل صاحب کے بقول وہ ہر دور کے حکمرانوں سے ملاقاتیں کرتے رہے ہیں، انہیں بلا کسی لالچ و حرص، بغیر کسی مالی مفاد حق وصداقت کی بات بتاتے رہے ہیں، گزشتہ حکمرانوں کی طرح موجودہ حکمران سے بھی انہیں کسی قسم کا کوئی لینا دینا نہیں ہے، موجودہ حکومت کے سربراہ کی تعریف وستائش میں مولانا طارق جمیل نے اگرچہ ساری حدود پائمال کی ہیں، اسی دوران ایک موقع پر انہوں نے پاکستانی میڈیا کے بارے میں کہہ دیا کہ یہ میڈیا جھوٹ بولتا ہے، جس پر میڈیا کے نامی گرامی صحافیوں کو سخت تکلیف پہنچی تو انہوں نے مولانا طارق جمیل کے خلاف بیٹھک لگالی، جس پر مولانا نے ان صحافیوں سے معافی مانگی، جس پر اہل علم و قلم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، روزنامہ جنگ کے کالم نگار محترم انصار عباسی صاحب نے اپنے ایک کالم میں ان ایمانی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ محترم مولانا طارق جمیل نے کس بات پر معافی مانگی، کیا میڈیا میں جھوٹ نہیں بولا جاتا؟ کیا فحاشی وعریانیت یہاں نہیں پھیل رہی؟ کیا قوم کی بیٹیوں کو نچایا نہیں جارہا؟ کیا ہماری عدالتیں اور قانون مظلوم کے بجائے ظالم کے حق میں نہیں؟

کیا ہم نے حرام کو حلال پر ترجیح نہیں دی؟ کیا ہم نے اپنے رب کو ناراض نہیں کیا؟ کیا ہمارے کاروبار میں سود کا عمل دخل نہیں؟ کیا یہاں ہر طاقتور ظالم نہیں بنا ہوا؟ اگر مولانا نے کسی میڈیا ہاؤس یا میڈیا سے متعلق جھوٹ بولنے کی بات کی اور

اُس میڈیا مالک کا نام نہیں لیا تو اُس میں اُنہوں نے ایسا کیا جرم کر دیا کہ جس کے لیے اُنہیں معافی مانگنا پڑی۔

مولانا سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ اُن کی کہی گئی کسی بات سے یا اُن کے کسی مخصوص طرزِ عمل پر اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے لیکن مجھے مولانا کا ٹی وی ٹاک شوز کے کٹہرے میں کھڑا کیا جانا اچھا نہیں لگا۔

اُن کا جس طریقے سے خصوصاً سوشل میڈیا پہ مذاق اڑایا گیا وہ بھی انتہائی غیر مناسب تھا، حتیٰ کہ میڈیا سے تعلق رکھنے والے کئی افراد نے اُن پر طنز کے تیر چلائے، مولانا نے تو بغیر بحث کیے میڈیا والوں سے معافی مانگ لی لیکن کیا جنہوں نے اُن کے بارے میں نازیبا باتیں کیں، اُنہوں نے معافی مانگی یا اُن سے معافی مانگنے کا مطالبہ کیا گیا؟

کیا ہم میڈیا والوں میں بہت سے ایسے نہیں جو جھوٹ بولتے ہیں؟ جو جھوٹے الزامات لگاتے ہیں؟ دوسروں کی پگڑیاں اچھالتے ہیں، فتنہ بازی اور شر انگیزی تک کرنے سے باز نہیں آتے، بحیثیت معاشرہ جھوٹ تو ویسے ہی ہم میں بہت عام ہے لیکن میڈیا تو سچائی کا علمبر دار ہوتا ہے اور اس لحاظ سے میڈیا سے سچ کی توقع زیادہ ہوتی ہے۔

مولانا نے اگر کسی میڈیا مالک کا نام نہیں لیا تو ہم بھی تو بہت سے نام نہیں لیتے اور کئی بار سچ جانتے ہوئے بھی سچ نہیں بولتے۔ جو کچھ میڈیا پر گزر رہا ہے، کیا اُس کے متعلق ہم نے سچ بولا؟ جس طرح گزشتہ چند سالوں میں سیاست نے کروٹیں کھائی ہیں، بہت کچھ جانتے ہوئے بھی کیا ہم نے حقیقت اور سچائی عوام کے سامنے رکھی؟

ہو سکتا ہے کوئی ایک دو نے کسی حد تک بات کی بھی ہو لیکن میڈیا کی اکثریت تو وہی سچ بولتی رہی جو سچ اُسے بولنے کے لیے کہا جاتا رہا۔ کیا ہم میڈیا والوں نے ہی ایک دوسرے پر غداری، غیر ملکی ایجنٹ ہونے اور ملک دشمنی کے الزامات نہیں لگائے؟

جب مولانا نے پاکستان میں بڑھتی ہوئی فحاشی و عریانی پر بات کرتے ہوئے کورونا کے عذاب یا آزمائش ہونے کی بات کی تو اس پر بھی مولانا کا مذاق اڑایا گیا اور مذاق اڑانے والوں میں حکومتی وزرا تک شامل تھے۔ ہو سکتا ہے اُن وزرا کو اس بات کا علم نہ ہو لیکن فحاشی و عریانیت کے بارے میں قرآن و حدیث میں سخت وعید ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ ایمان والوں میں فحاشی پھیلاتے ہیں وہ دنیا و آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔ایک حدیث مبارکہ کے مطابق: جس کسی قوم میں فحاشی عام ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُس قوم پر موت کو مسلط کر دیتا ہے۔ (مفہوم) اسی طرح ایک اور حدیث مبارکہ کے مطابق جب کسی قوم میں کھلے عام فحش کام ہونے لگ جائیں تو ان میں طاعون اور ایسی بیماریاں پھوٹ پڑتی ہیں جو ان سے پہلے لوگوں میں نہ تھیں۔) مفہوم) گویا مولانا نے فحاشی و عریانیت کے حوالے سے جو بات کی وہ سو فیصد اسلام کی بات ہے جس پر وزیراعظم عمران خان کی کابینہ کے چند ممبران اور ایم این ایز کی طرف سے اعتراض اور مولانا کا مذاق اڑایا جانا انتہائی شرمناک عمل ہے جس کی نہ صرف مذمت کی جانی چاہیے بلکہ اس پر ان وزرا کو معافی بھی مانگنی چاہیے۔ باقی جہاں تک مولانا طارق جمیل کا تعلق ہے تو بہت سے لوگوں کی دانست میں اُنہوں نے معافی مانگ کر ٹھیک کیا، و گرنہ میڈیا نے اُن کے پیچھے پڑے رہنا تھا۔ لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔ مولانا تبلیغِ اسلام کی وجہ سے دنیا بھر میں پہچانے جاتے ہیں اور اس بارے میں اُن کی بہت سی خدمات ہیں۔

اُن سے میری گزارش ہے کہ میڈیا، حکمرانوں اور دوسرے طاقتور طبقوں کو تبلیغ ضرور کریں اور اُنہیں سیدھے راستے پر چلنے کی تلقین بھی کریں لیکن ایسا تاثر نہ آنے دیں جیسے مولانا کی حکمران طبقہ سے دوستی ہے۔

میں پورے یقین، پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ فقیر کے پاس ایسے ذرائع نہیں ہیں کہ جن کے بل بوتے پر وہ ببانگ دہل متجسس دعویٰ کرتا پھرے۔ فقیر کی آگاہی کے وسائل اس کے اپنے ہیں۔ ان وسائل کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ کورونا کے بارے میں فقیر کی آگاہی اردو، ہندی اور انگریزی ٹیلی وژن چینلز تک محدود نہیں ہے۔ فقیر کو یقین ہے کہ کورونا وائرس God Sent نہیں ہے یعنی کورونا وائرس قدرت کی طرف سے بھیجا ہوا نہیں۔

کورونا وائرس Man-made ہے یعنی یہ وائرس سائنسدانوں کی ایجاد ہے۔ اس میں حیران ہونے جیسی کوئی بات نہیں۔ اگر سائنسدان ایٹم بم بنا سکتے ہیں تو پھر سائنسدان بایولوجیکل بم کیوں نہیں بنا سکتے۔ سائنسدان اگر کیمیکل ویپن بنا سکتے ہیں جس کے استعمال سے انسان جھلس جاتا ہے اور کھال ادھڑ جاتی ہے تو پھر سائنسدان کورونا وائرس کیوں نہیں بنا سکتے؟ جس روز قدیم دور کے انسان نے اپنے مدِمقابل کو دور سے وار کر کے مارنے کے لئے تیر کمان ایجاد کیا تھا، تب محسوس کرنے

والوں نے محسوس کر لیا تھا کہ آگے چل کر سورما دو بدو مدِ مقابل ہونے کے بجائے ایک دوسرے کو دور سے مارنے کے لئے نئی نئی ایجادات کرتے رہیں گے۔ ریوالور، رائفلیں، راکٹ، بم اور کیمیائی ہتھیار تیر کمان کا تسلسل ہیں۔ کورونا وائرس بھی دور سے مار ڈالنے اور مفلوج کرنے کا ہتھیار ہے۔ یہ میری سوچ نہیں، فقیر کی سوچ ہے۔

فقیر نے کیوں محسوس کیا کہ کورونا وائرس نظر نہ آنے والا ہتھیار ہے؟ آج کے جدید دور میں ایسے ایسے خود کار ہتھیار تیار کئے گئے ہیں جو ٹھیک نشانے پر جا کر لگتے ہیں۔ کورونا کو منتخب نشانوں پر آزمایا جا رہا ہے۔ کورونا بنانے والوں نے اپنی ایجاد آزمانے کیلئے غریب، مفلس، پسماندہ، غلیظ اور طرح طرح کے امراض میں گھرے ممالک کا انتخاب نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی بھیانک ایجاد آزمانے کیلئے انتہائی ترقی یافتہ، دولت مند اور فوجی لحاظ سے بے انتہا طاقتور ممالک کو چُنا ہے۔ امریکہ اور یورپ کے ممالک ان کے نشانے پر ہیں۔

ایشیائی ممالک میں پاکستان اور ہندوستان جیسے ممالک پر صرف کورونا کا مفلوج کرنے جیسا خوف طاری ہے۔ پاکستان اور بھارت نے کورونا وائرس کا مزہ نہیں چکھا ہے۔ پاکستان کی آبادی بائیس کروڑ ہے۔

کورونا سے مرنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گننے کے برابر ہے۔ پاکستان میں سینکڑوں کے حساب سے روزانہ لوگ کینسر، ہارٹ اٹیک، گردوں اور جگر کی بیماریوں اور ڈیلیوری کے دوران مر جاتے ہیں۔ غربت کی وجہ سے روزانہ مرنے والوں کی تعداد کا اندازہ آج تک کسی نے نہیں لگایا۔

کورونا وائرس کے حوالے سے فقیر ایک اور تھیوری پر بھی سوچ بچار میں پڑا ہوا ہے۔ کورونا وائرس سے وابستہ سائنسدان کچھ خاص اعداد و شمار حاصل کرنے کے

ساتھ ساتھ کورونا وائرس سے بچنے کیلئے احتیاطی تدابیر پر عمل پیرا ہونے کے بعد ماحولیات پر پڑنے والے اثرات کا سائنسی تجزیہ کررہے ہیں۔ کورونا سے متاثرہ ممالک کے حکمران ان حقائق سے واقف ہیں مگر اپنی رعایا کو ان حقائق سے آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اس وقت امریکہ سے لیکر برصغیر تک کروڑوں بلکہ اربوں گاڑیاں روڈ راستوں سے غائب ہیں۔ آلودگی کا نام ونشان غائب ہو چکا ہے۔

فیکٹریاں اور کارخانے دو تین مہینوں سے بند پڑے ہیں۔ فیکٹریوں اور کارخانوں سے خارج ہونے والے زہریلے مادے ماحول کو ناقابل برداشت نہیں بناتے۔ ان سے اٹھنے والی آوازوں کی آلودگی سے دنیا قدرے پاک ہو چکی ہے۔ حاکموں نے طے کر لیا ہے کہ جب تک سائنسدان اپنے مطلب کے اعداد وشمار حاصل نہیں کر لیتے وہ گاڑیوں اور کارخانوں کو چلنے نہیں دیں گے۔ اس کام میں زیادہ تعاون کرنے والے حاکموں کو امداد کی مد میں زیادہ پیسہ مل رہا ہے۔

اس تعاون میں خاص طور پر الیکٹرونک میڈیا نے لوگوں کو ڈرانے اور مر جانے کے خوف میں مبتلا کرنے کے نیک کام میں موثر کردار ادا کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے، اگر ہم کورونا سے بچ گئے تو پھر قیامت تک زندہ رہیں گے۔ حکومتوں نے اپنی رعایا کو کورونا سے اس قدر خوفزدہ کر دیا ہے کہ لوگوں نے کینسر، دل کے امراض، ایڈز، رینل فیلیوئر جیسی بھیانک بیماریوں سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ لوگ نہیں مانتے کہ کینسر سے دنیا بھر میں روزانہ ہزاروں آدمی مر جاتے ہیں۔ لوگوں نے عقیدہ بنالیا ہے کہ ہم صرف اور صرف کورونا سے مر سکتے ہیں۔ کسی اور بیماری سے ہم نہیں مر سکتے۔

آپ نے اوزون لیئر کا نام ضرور سنا ہوگا۔ زمین سے بیس پچیس کلومیٹر اوپر کھلی آنکھ سے نظر نہ آنے والی قدرتی دبیز تہہ بنی ہوئی ہے۔ اوزون لیئر سورج کی ناقابل

برداشت جھلسا دینے والی شعاعوں اور زمین کے درمیان حائل رہتی ہے۔ فقیر کی غیر سائنسی سوچ کے مطابق پچھلے تیس پینتیس برسوں میں انسان نے زمین پر ماحول اس قدر گندا کر دیا ہے کہ ہوا میں آلودگی کی وجہ سے اوزون لیئر میں کہیں شگاف پڑتے ہیں تو کہیں ڈرائونے سوراخ بن جاتے ہیں۔ سورج کی جھلسا دینے والی شعاعوں کی وجہ سے زمین پر ماحولیاتی حرارت ناقابل برداشت ہوتی جارہی ہے۔

انسان، جانور، نباتات، زراعت، پانی پر منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔ یہ جو پچھلے ہفتے سائنسدانوں نے اوزون لیئر کے شگافوں اور سوراخوں کے بند ہونے کی نوید دنیا کو سنائی ہے، وہ لاک ڈائون کے سبب ممکن ہوئی ہے۔ مگر کب تک؟ سرکار! طویل لاک ڈاؤن سے لوگ کہیں ناک ڈاؤن نہ ہو جائیں۔

① کسی وزیر کا ایک بیٹا کند ذہن تھا۔ اس نے اسے کسی دانشمند کے پاس بھیج دیا کہ تو اس کی تربیت کرتا رہے، ممکن ہے اس تربیت سے وہ عقلمند ہو جائے، اس دانشمند نے کچھ عرصے تک اس کی تعلیم و تربیت کی، لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا، چنانچہ اس نے ایک آدمی اس وزیر کے پاس بھیجا کہ یہ عقلمند تو بن نہیں رہا البتہ اس نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔

ترجمۂ اشعار: جب کسی گوہر (یا بچے) کی اصل قابل ہو تو اس پر تربیت کا اچھا اثر پڑتا ہے، (لیکن) جس لوہے کی اصل ہی بد گوہر ہو (اچھی قسم کا نہ ہو) تو کوئی بھی صیقل اس کو اچھا نہ بنا سکے گا، تو کسی کتے کو (بے شک) دریائے ہفت گا (یا عظیم دریا) میں دھو لیکن وہ جتنا گیلا ہوتا جائیگا اتنا زیادہ پلید ہو جائیگا۔

② ایک دانا اپنے بیٹوں کو نصیحت کر رہا تھا کہ جانِ پدر! (باپ کی جان) تم کوئی ہنر سیکھو، ملک، حکومت و دولتِ دنیا پر بھروسا مناسب نہیں، سفر میں سیم وزر تو خطرے میں ہیں، کیونکہ یا تو چور سارا سیم وزر اڑا لے جائے گا یا پھر مالک خود ہی تھوڑا تھوڑا کر کے کھا جائے گا (یعنی دولت آج کسی کے ہاتھ میں ہے تو کل کسی کے ہاتھ میں)

جبکہ ہنر ایک دولتِ مستقل ہے، اگر ایک ہنر مند کے ہاتھ میں دولت نہیں رہتی تو اس کا کوئی غم نہیں، اس لئے کہ ہنر خود ایک دولت ہے۔ وہ (صاحب ہنر) جہاں کہیں بھی جائے گا، اس کی قدر و منزلت ہو گی اور اسے اونچی جگہ پر بٹھایا جائے گا جبکہ ایک بے ہنر دوسروں کے لقمے حاصل کرتا اور سختیاں اٹھاتا ہے۔

ترجمۂ اشعار: جاہ و مرتبہ کے بعد دوسروں کا حکم ماننا بڑی تکلیف دہ بات ہے جس کی ناز کی عادت رہی ہو، اس کے لئے دوسروں کی سختی و ظلم اٹھانا ٹھیک نہیں یا ناقابل برداشت ہے۔

ایک مرتبہ ملک شام میں کوئی فتنہ برپا ہوا جس کے باعث ہر کوئی اپنے گوشے سے بھاگ گیا۔ (جبکہ) کسانوں کے دانشمند بیٹے بادشاہ کے وزیر بن گئے یا بننے کیلئے گئے (اور اس کے برعکس) وزیر کے ناقص عقل نادان بیٹے گداگری کرنے دیہات چلے گئے۔

③ میں نے دیارِ مغرب میں ایک مدرسے کے استاد کو دیکھا جو ترش رو، تلخ گفتار، بدخصلت، مردم آزار (لوگوں کو دکھ پہنچانے والا) گدا فطرت اور ناپرہیزگار (تقویٰ سے محروم) تھا۔ اسے دیکھ کر مسلمانوں کا عیش تباہ ہو جاتا، چند پاکیزہ لڑکے اور دوشیزہ (کنواری) لڑکیاں اس کی سختی کے ہاتھوں گرفتار تھیں۔ ان میں نہ تو ہنسنے کا حوصلہ تھا اور نہ بات کرنے کا یارا، اس لئے کہ وہ کبھی کسی کے تھپڑ مارتا اور کبھی کسی کو شکنجے میں کستا (سخت تکلیف دیتا) مختصر یہ کہ میرے سننے میں یہ بات آئی کہ لوگ اس کی کسی قدر خباثت نفس سے آگاہ ہو گئے، چنانچہ انہوں نے اسے پیٹا اور مدرسے سے نکال دیا، اور مدرسہ ایک مصلح (اصلاح کرنے اور نیکی کی طرف لانے والا) کے سپرد کر دیا۔ وہ ایک بردبار پارسا، نرم طبع اور نیک آدمی تھا جو ضرورت کے بغیر بات نا کرتا اور اس کی

زبان پر کوئی ایسے الفاظ نہ آتے جو دوسروں کے آزار کا باعث بنیں۔(اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچوں، طلباء کے سر سے پہلے استاذ کی ہیبت جاتی رہی، دوسرے استاذ کو انہوں نے فرشتوں کے سے اخلاق والا پایا، چنانچہ آہستہ آہستہ وہ شیطان، شریر بنتے چلے گئے اور اس کی نرمی کے بھروسے پر تعلیم کے حصول میں لاپرواہو گئے، وہ زیادہ تر وقت کھیل میں گزارنے لگے اور تختیاں ایک دوسرے کے سر پر مارتے۔

ترجمہ شعر: جب تعلیم دینے والا استاذ بے آزار ہو تو بچے بازار میں خرسک کا کھیل کھیلنے لگ جاتے ہیں۔

کوئی دو ہفتے بعد میرا اس مسجد میں جانا ہوا۔ وہاں میں نے پہلے والے معلم کو دیکھا جس سے لوگوں کے دل خوش ہو گئے۔ مجھے دکھ ہوا اور میں نے لاحول پڑھا کہ ابلیس (پہلے والا معلم) کو فرشتوں کا پھر کیوں استاذ بنادیا گیا ہے، ایک بوڑھے جہاندیدہ مرد ظریف نے کہا:

ترجمۂ اشعار: ایک بادشاہ نے اپنا بیٹا مکتب میں بھیج دیا اور اس کی سیمین (چاندی کی یا سفید) تختی اس کے پہلو میں رکھ دی، اس کی تختی پر سونے سے یہ لکھا ہوا تھا کہ استاذ کا ظلم و جبر بہتر ہے کہ باپ کی محبت یعنی استاذ کے سخت رویے کے باعث بچے تعلیم پر توجہ دیتے ہیں ورنہ کھیل کود میں لگے رہتے ہیں۔

(۴) ایک پارسازادے کو اپنے چچاؤں کی وراثت سے بہت سی دولت ملی۔(اس دولت کے ملنے پر) اس نے فسق وفجور (بدکاری) شروع کردیا۔ مختصر یہ کہ ایسا کوئی گناہ اور برا کام نہ تھا جو اس نے نہ کیا ہو اور نشہ آور چیزیں نہ کھائی پی ہوں، ایک مرتبہ میں نے اس سے نصیحت کے طور پر کہا کہ اے بیٹے! آمدنی (دولت) چلتے ہوئے پانی کی مانند ہے اور عیش چلتی ہوئی چکی کی مانند، یعنی حد سے زیادہ خرچ کرنا اسی کو زیب دیتا ہے یا اسی کیلئے مسلم ہے جس کی مقررہ آمدنی ہو۔

ترجمۂ شعر: جب تیری کوئی آمدنی نہیں ہے تو تُو خرچ تھوڑا کر، اس لئے کہ ملاح یہ گایا کرتے ہیں کہ، اگر بارش پہاڑوں پر نہ برسے تو ایک سال میں دجلہ (جیسا بہت بڑا دریا) ایک خشک ندی بن جائے، تو عقل وادب کو اختیار کر اور لہو ولعب کو چھوڑ دے، اس لئے کہ جب دولت ختم ہو گئی تو تجھے سختی اٹھانا پڑے گی تو پشیمانی میں پڑ جائیگا۔

لڑکے نے اپنی لذت ناؤنوش (کھانے پینے کی لذت) کے باعث میری اس بات پر کوئی توجہ نہ دی اور میرے قول پر اس نے اعتراض کیا اور بولا فوری یا میسر راحت کو آنے والی تکلیف کی تشویش میں منغض کرنا عقلمندوں کی رائے کے خلاف ہے:

ترجمۂ اشعار: مقاصد والے اور خوش بختی کے حامل انسان سختی کے خوف سے سختی کھاتے ہیں (کیوں کہ اپنے آپ کو وقت سے پہلے سختی میں مبتلا کر لیتے ہیں، اے میرے دل افروز (دل کو روشن کرنے والے) دوست! جا خوشیاں منا، اس لئے کہ آج آنے والے کل کا غم کھانا مناسب یا اچھا نہیں۔

پھر میں بھلا ایسا کیوں سوچوں کہ میں مروت کی بلندی پر بیٹھا ہوں اور جوانمردی سے میں نے ناتا جوڑ رکھا ہے اور میرے انعام (یا میری دولت) کا چرچا لوگوں کی زبان پر ہے۔ یہ حکایتیں شیخ سعدیؒ مرحوم کی مشہور زمانہ کتاب گلستان سے لی گئی ہیں۔ ترجمہ محترم جناب ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی نے کیا ہے۔

دنیا بھر کے مفکرین، دانشور، معیشت دان اور اہلِ دانش اس سال، یعنی ۲۰۲۰ء کے آغاز سے ہی حیرت میں ڈوبے ہوئے ہیں، وہ جس کورونا وائرس کو گذشتہ صدی میں پھیلنے والی دیگر وباؤں، ایڈز، ایبولا، کانگو، سارس، برڈ فلو اور سوائن فلو جیسی کوئی وبا تصور کر رہے تھے، یہ ان سے بالکل مختلف نکلی اور اس کی وسعت نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔

وباؤں کے بارے میں سائنس دانوں کا عمومی تجزیہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مخصوص علاقوں سے شروع ہوتی ہیں اور جیسے ہی محدود علاقوں میں پھیلتی ہیں، ان کو وہیں روکا جا سکتا ہے، بعض وبائیں تو مخصوص گروہوں یا خاص عادات والے افراد کے لیے خاص ہو کر رہ جاتی ہیں، جیسے ایڈز اپنے آغاز میں ہی جنسی بے راہ روی اور غیر فطری اختلاط سے پھیلتی تھی اور آج تک اس کا بنیادی ماخذ کسی ایڈز زدہ شخص سے جنسی اختلاط ہی ہے، لیکن جدید مغربی تہذیب کی اخلاقیات میں آزاد جنسی ماحول چونکہ ایک بنیادی قدر ہے اس لیے سیکولر لبرل پراپیگنڈہ مشینری نے ایڈز کی ثانوی (Secondary) وجوہات مثلاً ایڈز زدہ شخص کی خون آلود سرنج، حجام کے استرے، یا ڈینٹل سرجن کے آلات کو بھی پھیلنے کی بنیادی (Primary) وجوہات یعنی جنسی اختلاط کے برابر

بتانا شروع کر دیا، تاکہ جدید مغربی تہذیب کے قحبہ خانے سلامت رہیں اور لوگوں میں اپنے جیون ساتھی تک محدود رہنے کی اخلاقیات کو اہمیت حاصل نہ ہو سکے، اسی طرح دیگر وباؤں کو بھی مخصوص علاقوں اور مخصوص نسلوں کی بیماریاں بتایا گیا اور دنیا بھر کے طبّی ماہرین اور صحت کے اداروں نے ان وباؤں کو ان علاقوں اور نسلوں تک پوری تگ و دو سے محدود کر دیا، جیسے افریقہ میں ''ایبو۔لا'' اور چین میں سارس، لیکن آج کے کورونا کے وائرس کا میدانِ جنگ پورا کرّہ ارض ہے اور اس کارزار میں وہ ابھی تک فاتح کی حیثیت سے دندناتا پھر رہا ہے۔

اس کے وار سے بچا تو جا سکتا ہے لیکن اس کے وار کو مکمل طور پر روکا نہیں جا سکتا، اس کی موت لانے کی صلاحیت کو کچھ دیر کے لیے کنُد تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اسے ختم نہیں کیا جا سکتا، نمرود کے دماغ میں گھسے ہوئے اس مچھر کی طرح کہ نمرود کے سر کو جوتوں سے پیٹا جاتا تھا تو اسے سکون ملتا۔

اپنے دور کے عظیم طبیبوں نے نمرود سے کہہ دیا تھا کہ تمہیں اب اس مچھر کے ساتھ ہی گذارا کرنا ہے، آج پانچ ہزار سال بعد، کورونا کے بارے میں بھی ویسے ہی ٹرمپ جیسا طاقتور صدر، عالمی ادارۂ صحت کا سربراہ اور لیبارٹریوں میں دن رات ویکسین ایجاد کرنے میں مصروف سائنسدان بھی وہی بات کر رہے ہیں جو نمرود کے طبیب اسے کہتے تھے، ''تمہیں اس کے ساتھ گذارا کرنا ہے'' اور جدید مغرب زدہ، آزاد خیال مرعوب افراد کی زبان میں You Have To Live With It ۔ چاروں جانب پھیلی بے بسی نے دنیا کے ہر سوچنے والے کو حیرت میں ڈال رکھا ہے۔

دنیا بھر میں سنجیدہ تحریر، پر مغز گفتگو اور محنت طلب تحقیق کرنے والے صاحبانِ علم کے سامنے لاتعداد سوال کھڑے ہو چکے ہیں، ان سوالات کے لاتعداد جواب ہیں، لیکن جس طرح سائنس دان کورونا کا کوئی ایک علاج بتانے میں بے بس

ہیں ویسے ہی یہ عالمی سطح کے مفکرین ان تمام سوالوں کے ممکنہ جوابات کی آگاہی سے عاری نظر آتے ہیں، جھنجلاہٹ ان کی تحریروں اور تقریروں سے ظاہر ہے، وہ لاتعداد تبصرے کرتے ہیں، دور کی کوڑیاں ملاتے ہیں، مگر ایک بہت واضح فقرہ بولنے سے محروم ہیں۔

یہ فقرہ ایسا ہے کہ عقل پر بھروسہ انہیں ایسا کہنے کی اجازت نہیں دیتا، کیونکہ یہ فقرہ ''ایمان بالغیب'' کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے یہ فقرہ ہم سادہ لوح مسلمان روز بولتے اور برتتے ہیں کہ ''دیکھو پردۂ غیب سے کیا ظہور ہوتا ہے''۔ جدید مغربی سیکولر علم اس فقرے سے ناآشنا ہے اور اس جدید علم کو آج اسی فقرے کا سامنا ہے۔

جدید دنیا کے مفکرین کو آج جن سوالات کا سامنا ہے، انہیں برطانیہ سے تعلق رکھنے والے، کیمرج یونیورسٹی سے فلسفہ، تاریخ اور سیاست میں سند یافتہ گارڈین (Guardian) اخبار کے کالم نگار سائمن ٹسڈال (Simon Tisdall) نے اپنے ۲۸ مارچ ۲۰۲۰ء کے کالم میں یکجا کیا ہے، ان سوالات کا نچوڑ یہ ہے کہ ''یہ لمحہ ایسا ہے کہ تاریخ بدل رہی ہے''۔ سب سے اہم اور جواب طلب سوال یہ ہے کہ کیا کورونا وائرس سے آنے والی تبدیلیوں سے دنیا مستقل طور پر بدل جائے گی، طاقت کا توازن کسی دوسرے سمت منتقل ہو جائے گا، اور کیا اکثر انسانوں اور ملکوں کے لیے زندگی اب ویسی نہیں رہے گی جیسی پہلے تھی۔

کورونا سے آنے والی بڑی تبدیلی کے بعد کیا دنیا مکمل طور پر تباہ و برباد ہو جائے گی یا ایک نئے دور کا آغاز ہو گا، ایسے سوالات کے جو جوابات مختلف دانشوروں اور تجزیہ نگاروں نے معروضی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی حوالے سے دیئے ہیں، انہیں کالم نگار نے اپنے کالم میں جمع کرنے کی کوشش ہے، یہ تمام جوابات خالصتاً محدود مادہ پرست تجزے کے عکاس ہیں، ایک ایسا تجزیہ کہ جو نظر آنے والی، محسوس ہونے والی

اور عقل کے دائرے میں سمجھی جانے والی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر ان کے تناظر میں کیا جاتا ہے۔

چونکہ جدید سیکولر علم اور تہذیب "روح" کی حقیقت سے آشنا نہیں، اسی لیے تجزیہ صرف مادیت کے تناظر میں کیا جاتا ہے، پروفیسر ٹِس ڈال نے اس مضمون میں اس عالمی خوف کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جو اس وقت پوری مغربی دنیا کے اذہان پر چھایا ہوا ہے، وہ خوف یہ ہے کہ کیا ہم پہلے جیسے مادر پدر آزاد، معاشی طور پر خوشحال اور عالمی سطح پر متحد رہ پائیں گے۔

اس خوف کو واضح کرنے کے لیے اس نے ہارورڈ(Harvard)یونیورسٹی میں عالمی تعلقات کے پروفیسر سٹیفن والٹ(Stephen Walt) کے ایک علمی اور تحقیقی مضمون میں درج شدہ تجزیے کا حوالہ دے کر بتانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا اب کیسی ہو جائے گی۔

پروفیسر کے مطابق کورونا کے بعد ریاست کا ادارہ بہت مضبوط ہو جائے گا اور قومیتوں کا تعصب بہت بڑھ جائے گا، وائرس سے نمٹنے کے لئیے حکومتی ادارے ان دنوں بہت سی ایسی طاقتوں کا استعمال کر رہے ہیں جو پہلے نہیں کرتے تھے، اور وباء کے خاتمے کے بعد وہ اس قوت اور طاقت سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے، طاقت کا مرکز مغرب سے مشرق کی طرف منتقل ہو جائے گا، معاشی خوف سے سرحدیں مزید مضبوط کر دی جائیں گی اور چھوٹی سے چھوٹی قوموں میں بھی اپنے وسائل پر قبضے کا رجحان بڑھے گا، گلوبل ویلج اور گلوبلائزیشن کا خواب چکنا چور ہو جائے گا اور دنیا آمدورفت کے لیے کھلی نہیں رہے گی اور نہ ہی خوشحال اور اتنی آزاد۔

مضمون نگار نے ایسے پانچ بڑے تاریخی لمحات کا حوالہ دیا ہے جب دنیا مکمل طور پر بدل گئی تھی۔ پہلا مرحلہ ۱۹۲۰،۱۹۱۹ء میں ہونے والی ورسائی (Versailles)

امن کانفرنس تھی جس کے نتیجے میں قومی ریاستیں وجود میں آئیں، خلافتِ عثمانیہ ٹوٹی، دوسرا مرحلہ، ۱۹۳۰ء کے آس پاس کی معاشی کساد بازاری (Great Depression)، تیسرا مرحلہ ۴۳، ۱۹۴۲ میں ولگا کے ساحلوں پر ہٹلر کی فوجوں کی شکست اور دوسری جنگ عظیم کے بعد بدلتی ہوئی دنیا، چوتھا مرحلہ ۱۹۸۹ء میں دیوارِ برلن کا ٹوٹنا، سوویت یونین کا خاتمہ اور امریکی بالادستی، جبکہ پانچواں مرحلہ ۹/۱۱ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی اور دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا آغاز، تاریخ کے یہ پانچوں موڑ ایسے ہیں جو انسانوں نے خود پیدا کیے، خود ڈیزائن کیے اور ان سے مطلوبہ مقاصد حاصل کیے۔

ان میں جو کچھ ہوا، جیسا بھی ہوا وہ سب ایک معلوم سکرپٹ کے مطابق تھا، لیکن ۲۰۲۰ء کی یکم جنوری کو دنیا پر دستک دینے والا کورونا وائرس نہ کسی انسانی ذہن کی اختراع ہے اور نہ ہی کوئی اسے اپنے سکرپٹ کے مطابق پھیلانے یا ختم کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

یہ اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ غالب اور مالکِ کائنات کے حکم کے مطابق غالب رہے گا، یہ دنیا بدل رہی ہے، لیکن اب اسے انسان اپنی مرضی سے نہیں بدل سکے گا، سید الانبیاء ﷺ کی احادیث کی روشنی میں یہ دنیا کے انجام سے تھوڑا پہلے شروع ہونے والے آخری دور کا سرورق ہے، اس دور میں موجود تمام نظامِ ہائے زندگی نے تباہ و برباد ہونا ہے۔ جدید مغربی تہذیب کے کھنڈر پر خلافتِ علیٰ منہاج النبوہ کی عمارت نے ایک دن تعمیر ہونا ہے۔

ایک عرصہ سے علماء کرام اور مذہبی جماعتوں کا مطالبہ تھا کہ پاکستان میں ایسا قانون بنایا جائے جس میں حضرت نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کی عزت اور ناموس کی بے حرمتی کرنے والوں کو قانونی دائرے میں لا کر انہیں ان کی ذمہ داری کا احساس دلایا جائے، نبی کریم ﷺ کے ناموس کے تحفظ کی خاطر پاکستان کے قانون میں ۲۹۵ سی شق موجود ہے، جس میں توہین رسالت کی سزا سزائے موت ہے، مگر افسوس اس کے باوجود آج تک یہاں کسی گستاخ رسول کو اس شق کے مطابق سزا نہیں دی گئی، سزا تو دور کی بات ہے ہمارے حکمرانوں کی اشیر باد سے گستاخانِ رسول کو یہاں سے دوسرے ممالک جانے کے راستے ہموار کیے گئے۔

یہاں ایرانی مطبوعہ کتابیں امپورٹ ہوئیں تو راز کھلا کہ ان میں حضرات صحابہ کرامؓ کے خلاف کس طرح کھل کر گستاخیاں کی گئی ہیں، پھر یہاں پاکستان میں مقامی حرماں نصیبوں نے کتابیں تحریر کیں جن میں صحابہ کرامؓ کو غلیظ گالیاں دی گئیں، علماء کرام نے ان کتابوں اور تحریروں کی بروقت نشاندہی کی تھی، ان کتابوں کے

عکس تاریخی دستاویز نامی کتاب میں مؤرخ اسلام مولانا ضیاء الرحمان فاروقی شہید نے جمع کیے تھے، اس دور کے حکمرانوں کے سامنے وہ کتاب پیش کی گئی تھی، عدالتوں میں وہ کتاب پیش کی گئی تھی، مگر تاحال ان تحریروں اور ان کے لکھنے والوں کو کٹہرے میں کھڑا نہ کیا جاسکا۔

ان تحریروں کے بہت سے محرر موت کی نذر ہو چکے، قبروں میں پہنچ گئے، مگر وہ غلیظ مواد آج تک ان کتابوں میں موجود ہے، اسی ناقابل برداشت مواد کی موجودگی میں یہاں لڑائیاں لڑی گئیں، قتل و قتال کا ایک بازار گرم کیا گیا، بے شمار لوگ مارے گئے بلکہ چن چن کر مارے گئے، مگر کسی حکومت کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی کہ اس حساس مسئلہ کا کوئی بہترین حل نکالا جائے۔

اب یہ بات سب کی خوشی اور مسرت کا باعث ہے کہ پنجاب اسمبلی میں مجاہد ختم نبوت مولانا منظور احمد صاحب چینوٹی کے فرزند مولانا محمد الیاس چینوٹی اور جرنیل ناموس صحابہ مولانا محمد اعظم طارق شہید کے فرزند ارجمند مولانا محمد معاویہ اعظم طارق کی موجودگی میں پاکستان مسلم لیگ (ق) کے راہنما چوہدری پرویز الٰہی کی قیادت میں پنجاب اسمبلی میں درسی اسلامی کتب کے متعلق مسلم لیگ (ق) کی رکن اسمبلی محترمہ خدیجہ عمر کا پیش کردہ بل متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا جس کے تحت حضور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی شان میں گستاخی کو روکنے کے لئے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کو اسلامی درسی کتب کی اشاعت سے پہلے متحدہ علماء بورڈ سے منظوری لینے کا پابند کر دیا گیا۔ (مسلم لیگی راہنما عمار یاسر صاحب کا اس میں بنیادی کردار ہے)

اس میں شبہ نہیں کہ متذکرہ بل کی منظوری انتہائی قابل تحسین کارنامہ اور وقت کی اہم ضرورت تھی، پنجاب اسمبلی نے متفقہ طور پر بل منظور کر کے مقدس

ہستیوں کی شان میں گستاخی کا ہمیشہ کے لئے دروازہ بند کر دیا ہے۔

اخبارات میں اس بل سے متعلق یہ خبر شائع ہوئی ہے، ملاحظہ فرمائیں، پنجاب اسمبلی میں درسی اسلامی کتب کی اشاعت سے متعلق بل متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا، پنجاب اسمبلی کا اجلاس ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ کی تاخیر سے سپیکر پرویز الٰہی کی صدارت میں شروع ہوا۔ اجلاس میں حضرت محمد ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی شان میں گستاخی کو روکنے کے لیے درسی کتب کی اشاعت متحدہ علماء بورڈ کی منظوری سے مشروط کر دی گئی، پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ ترمیمی بل ۲۰۲۰ء متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا بل چودھری پرویز الٰہی کی کوششوں سے منظور ہوا، مسلم لیگ ق کی رکن اسمبلی خدیجہ عمر کے پیش کردہ بل میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کو پابند کر دیا گیا کہ اسلامی کتب کی اشاعت سے پہلے متحدہ علما بورڈ سے منظوری لے۔

سپیکر پنجاب اسمبلی چودھری پرویز الٰہی نے کہا کہ شر کے اس دروازے کو ہمیشہ کے لئے بند کرنے کا وقت آ گیا ہے، اہم قانون اس لئے لا رہے ہیں کہ ہماری آئندہ نسل محفوظ رہے، انہوں نے کہا کہ آئے روز مقدس شخصیات کے خلاف سازشیں کی جا رہی ہیں، بچوں کے ذہنوں میں اسلام، اہل بیتؓ اور صحابہ کرامؓ کے خلاف نفرت اور شبہات پیدا کئے جا رہے ہیں۔ ۹۲ نیوز)

روزنامہ نوائے وقت میں ہے، سپیکر چودھری پرویز الٰہی نے بل کی منظوری پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آئے روز جو دین اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ لے کر آئے ہیں اس کے خلاف سازشیں ہوتی ہیں، بالخصوص سکول میں ہمارے بچوں اور بچیوں کو جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کے ذہن میں دین اسلام، خلفاء راشدین، اہل بیت اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے خلاف نفرت انگیزی اور شکوک و

شبہات پیدا کئے جاتے ہیں، اب وقت آ گیا ہے کہ انشاءاللہ اس شر کے دروازے کو ہمیشہ کیلئے بند کر دیں، اس لئے ہم یہ اہم قانون سازی لے کر آرہے ہیں تاکہ ہماری آئندہ نسل محفوظ رہے جو ہمارا مستقبل ہے۔روزنامہ نوائے وقت ۱۱جون ۲۰۲۰ء)

روزنامہ ۹۲نیوز نے اسمبلی فلور سے پاس کروائے گئے اس بل پر تحسین کرتے ہوئے اپنے اداریہ میں لکھا کہ کئی برسوں سے متعدد حلقوں کی طرف سے اسلامی درسی کتب میں ایسی غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی رہی ہے جن سے مقدس ہستیوں کی توہین کا پہلو سامنے آتا ہے۔

درسی کتب کی اشاعت انتہائی حساس معاملہ ہے اس لئے حضور نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں دی گئی معلومات کے سلسلہ میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں ذرا سی غلطی بھی کسی اسلامی حلقہ فکر میں قابل برداشت نہیں ہے لہٰذا پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کو اسلامی کتب کی اشاعت سے پہلے انتہائی احتیاط اور گہرے غور و فکر سے کام لینا چاہیے تاکہ سکولوں اور کالجوں کے بچے اور نوجوان صحیح اسلامی معلومات اور عقائد سے آشنا ہو سکیں۔

سپیکر پنجاب اسمبلی پرویز الٰہی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اس نئے قانون سے ہماری آئندہ نسلیں شکوک و شبہات سے محفوظ ہو جائیں گی، اسی طرح اسلامی کتب کی اشاعت سے پہلے متحدہ علماء بورڈ سے ان کی منظوری سے شر کے بہت سے دروازے بند ہو جائیں گے۔(۱۱جون ۲۰۲۰ء جمعرات)

متحدہ علماء بورڈ سے منظوری کی شرط ٹھیک ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ متحدہ بورڈ کا اپنا علمی اور تحقیقی دائرہ کار کیا ہے، اس میں کس طرح کے لوگ شریک ہیں، بہر

حال جو بھی ہو گستاخی کا سد باب کرنا ہے، گستاخوں کو روکنا ہے، نہ رکنے کی صورت میں انہیں قانون کے شکنجے میں کسنا ہے۔

یہاں یہ بات محسوس کی جارہی ہے کہ یہ بل ۲۰۲۰ء صرف کتب کی اشاعت وتصنیف سے متعلق پاس کیا گیا ہے، درسی کتابوں کی اشاعت وتدوین سے پہلے متحدہ علماء بورڈ کو مواد دکھایا جائے گا، بورڈ کی منظوری کے بعد اسے زیور طباعت سے آراستہ کیا جائے گا، پھر اسے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے کی اجازت ہوگی۔

یہاں تک تو بات سمجھ میں آگئی ہے مگر جو لوگ اپنے طور پر کتابیں لکھتے اور اپنے مال وزر سے شائع کرتے ہیں انہیں کس ضابطہ اخلاق کا پابند بنایا جائے گا، وہ لوگ تو کسی دائرہ کار میں نہیں لائے گئے، ان کی کتابوں اور تصنیفات کو کس پیمانے سے پرکھا جائے گا، حالانکہ زیادہ تر خرابی اپنی تحقیقات کی روشنی میں پھیلائی جاتی ہے، اپنی خانہ ساز تحقیقات اور محققانہ انداز نے ہی امت مسلمہ کے حصے بخرے کیے ہیں۔

اس لیے میری حکومت سے التجا ہے کہ وہ ایسا جامع اور مانع قانون بنائے جس کی سب مصنفین ومؤلفین سختی سے پابندی کریں، قرآن وسنت اور سلف صالحین کے منہج کو سامنے رکھتے ہوئے امت مسلمہ کی راہبری کی جائے، خود ساختہ تعبیرات وتوجیہات سے امت مرحومہ کو بچایا جائے۔

قومی اسمبلی سے منظور شدہ قانون ناموسِ رسالت پر سختی سے عمل کروایا جائے کسی رورعایت کے بغیر گستاخانِ رسول کو سزائے موت دی جائے، اسی طرح ایسا سخت قانون بنایا جائے جس میں اصحابِ رسول، اہل بیتِ عظام کی شان میں توہین قابل سزا قرار دی جائے، جب بھی کسی سے دانستہ طور پر ایسی غلطی کا ارتکاب ہو تو اسے عبرت ناک سزا سے دوچار کیا جائے تاکہ وہ دوسروں کے لیے عبرت بن جائے، تب جاکر حالات درست ہوسکتے ہیں، نشستن گفتن اور برخاستن سے کچھ ہاتھ نہیں آئیگا۔

وطنِ عزیز میں ''آئین شکنی'' تو مانوس و معروف اصطلاح ہے لیکن ''آئینہ شکنی'' اپنا ٹھوس وجود رکھنے کے باوجود ابھی تک کسی سیاسی یا سماجی اصطلاح میں نہیں ڈھل سکی۔ آئین شکنی کو ہمارے دستور میں جرمِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے جسے عرفِ عام میں غداری کہا جاتا ہے۔

پاکستان میں یہ جرم بہ تکرار ہوتا رہا ہے لیکن کسی آئین شکن کو ملامتی یا علامتی سزا نہیں دی جا سکی۔ پرویز مشرف کے بارے میں ایک خصوصی عدالت نے یہ کوشش ضرور کی لیکن یہ غیر حقیقت پسندانہ اور بُری حد تک گستاخانہ فیصلہ لاہور کی بڑی عدالت نے کالعدم قرار دے کر تاریخ کو اُسی صراطِ مستقیم پر ڈال دیا جس پر وہ برس ہا برس سے چل رہی تھی۔

آئین شکنی اور آئین شکنوں پر تو کچھ نہ کچھ لکھا جاتا رہا ہے بلکہ بڑی مستند اور جامع رپورٹس بھی مرتب ہوئی ہیں جنہیں قدیم قلمی مخطوطوں کی طرح ہم نے نہایت مضبوط فولادی الماریوں میں محفوظ کر رکھا ہے لیکن آئینہ شکنی پر کچھ کام نہیں ہوا۔

آئینہ کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مدِ مقابل کھڑے شخص کے حقیقی خدوخال جوں کے توں دکھا دیتا ہے۔ آئینہ اگر اصلی اور نسلی ہو تو وہ کسی کا لحاظ نہیں

کرتا۔ مروت نام کی کوئی شے اس میں نہیں ہوتی، سو وہ سامنے کھڑے شخص کے مقام و مرتبہ کو خاطر میں لائے بغیر سب کچھ سچ سچ، بلا کم و کاست بتا دیتا ہے۔ میڈیا کو بھی آئینے سے تشبیہ دی جاتی ہے جو اگر اپنے بنیادی وظیفے سے واقف ہو تو حکمرانوں اور زور آوروں کو اُن کی حقیقی تصویر دکھانے سے نہیں ڈرتا۔

کچھ لوگ تو نہ چاہتے ہوئے بھی سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں لیکن حکومتیں چونکہ حکومتیں ہوتی ہیں، اس لئے وہ آئینے کی اس گستاخی یعنی میڈیا کی حق گوئی و بے باکی کو پسند نہیں کرتیں۔ اگر حکومتِ وقت کی باگ ڈور کسی بیحد حساس اور اپنی ذات سے نرگسیت کی حد تک پیار کرنے والی شخصیت کے ہاتھ میں ہو تو آئینے کے بارے میں حساسیت بھی کئی گناہ بڑھ جاتی ہے۔ آئینے کے سامنے کھڑے شخص کی آرزو ہوتی ہے کہ آئینہ اس کے چہرے کے خدوخال وہ نہ دکھائے جو فی الواقع ہیں بلکہ وہ دکھائے جو اُسے پسند ہیں، مثلاً آنکھیں اگر چندھی چندھی اور بجھی بجھی سی ہیں تو آئینہ اُن میں صبحِ خوش جمال کی تابش سمو دے۔

چہرے کا رنگ اگر پھیکا پڑ گیا ہے تو آئینہ اس میں شفق کی تمازتیں بو دے۔ عارض ورخسار کی پیلاہٹ میں سرخ گلابوں کی رعنائیاں بکھیر دے۔ ماتھے کی شکنوں کو تحلیل کر کے ماہِ کمال کی چاندنی بھر دے۔ بالوں میں اگر چاندی بھرنے لگی ہے تو آئینہ ازخود سرمئی گھٹاؤں کی سرماہٹ سے کام لے۔ غرضکہ ادھیڑ عمری یا بڑھاپے یا کسی بھی اور وجہ سے بے ڈول اور بے ڈھنگے ہو جانے والے چہرے میں عہدِ شباب کی تمام تر رعنائیاں سمو کر اُسے جوانِ رعنا بنا دیا جائے۔

بظاہر ایسا ممکن نہیں۔ آئینہ اگر واقعی آئینہ ہے تو وہ فوٹو شاپ جیسے کرتب نہیں جانتا۔ وہ ڈینٹر پینٹر کے فن سے بھی ناآشنا ہوتا ہے۔ وہ مصور بھی نہیں ہوتا کہ کسی

چہرے کے پوٹریٹ کواُس کے من پسند خدو خال میں ڈھال دے۔تاہم دور جدید میں جس طرح بہت سے نا قابل یقین انقلابات آگئے ہیں،اسی طرح ایسے طلسماتی آئینے بھی ایجاد ہو گئے ہیں جو اپنی سچی، بے لاگ اور حقیقی رائے دینے کے بجائے،اپنے سامنے کھڑے شخص کے دل میں بُکل مارے بیٹھی آرزوئوں کو پڑھ لیتے اور اس کے خدوخال کو عین اس کی مرضی کے مطابق ڈھال دیتے ہیں۔

سو میرے جیسا ایک گیا گزرا شخص بھی اپنے آپ کو مرقع حسن و جمال سمجھنے لگتا ہے۔ سمجھنے ہی نہیں لگتا، صدقِ دل سے اس پر ایمان بھی لے آتا ہے۔وہ آئینے کی اس منافقانہ ہنر کاری کو ہرگز فریب کاری نہیں سمجھتا۔اُسے کامل یقین ہوتا ہے کہ وہ واقعی اتنا حسین و جمیل ہے جتنا یہ آئینہ بتارہاہے۔

سو ایسے آئینے بے حد عزیز ہوتے ہیں اور انہیں سونے کے فریم میں جڑ کر رکھا جاتا ہے،اگر کسی دوسری دیوار پہ سجا کر کوئی آئینہ ،زمینی حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے، مدِ مقابل کو اس کے حقیقی نقوش دکھانے کی کوشش کرے تو اس کا لہو کھول اٹھتا ہے وہ اپنے سامنے پڑی کوئی بھی شے آئینے پر پھینکتا اور اُسے کرچیاں کر دیتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس قتلِ ناروا کے بعد بھی آئینے کی ہر کرچی سچ بولتی رہتی ہے۔

میں (بقول برادر محترم عطاء الحق قاسمی)اپنی شاعری کو اپنے عیبوں کی طرح چھپائے رکھتا ہوں۔حال ہی میں کہی گئی غزل جو میں نے قاسمی صاحب کو بھی بھیجی تھی،کا ایک شعر ہے

آئین شکن کوئی تو کوئی آئینہ شکن ہر راہبر میں فطرتاً بے راہ روی سی ہے

یہ بے راہ روی واقعی حکمرانوں کی فطرت کا حصہ ہوتی ہے۔حکمرانوں ہی کو کیا مطعون کرنا،ہر شخص کی جبلت میں یہ بات شامل ہے کہ اس کی شخصیت کی کوئی کجی یا

کمزوری آشکار نہ ہو۔ البتہ وہ اپنی اس خواہش کے مطابق ''آئینہ سازی'' یا ''آئینہ شکنی'' کی قدرت نہیں رکھتا سو صبر شکر کر کے بیٹھ رہتا ہے۔

حکمران اور زور آور لوگ اپنی کارگاہِ فن میں ایسے اجزائے ترکیبی رکھتے ہیں کہ اپنی پسند کے آئینے ڈھال لیں اور اُن کے چہرے کی من پسند تشکیل نہ کرنے والے آئینوں کو عبرت کا نشان بنادیں۔ سو ایک زمانے سے یہ روایت چلی آرہی ہے کہ میڈیا کے نگار خانے کا کوئی آئینہ، اگر سچ بولتا یا کم از کم اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لئے بقدر ہمت و توفیق، حکمرانوں کے حقیقی خدوخال دکھانے کو اپنی پیشہ ورانہ عصمت کا تقاضا خیال کرتا ہے تو اُسے نشانے پہ دھر لیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں جس طرح تسلسل کے ساتھ دستورِ پاکستان کے پرزے رزقِ خس و خاشاک ہوتے رہے اسی طرح گستاخانہ روش سے باز نہ آنے اور خود پرستی کی حد تک خود پسند حکمرانوں کو اُن کے چہرے کے حقیقی خدوخال دکھانے والے آئینے بھی کرچیاں ہوتے رہے۔
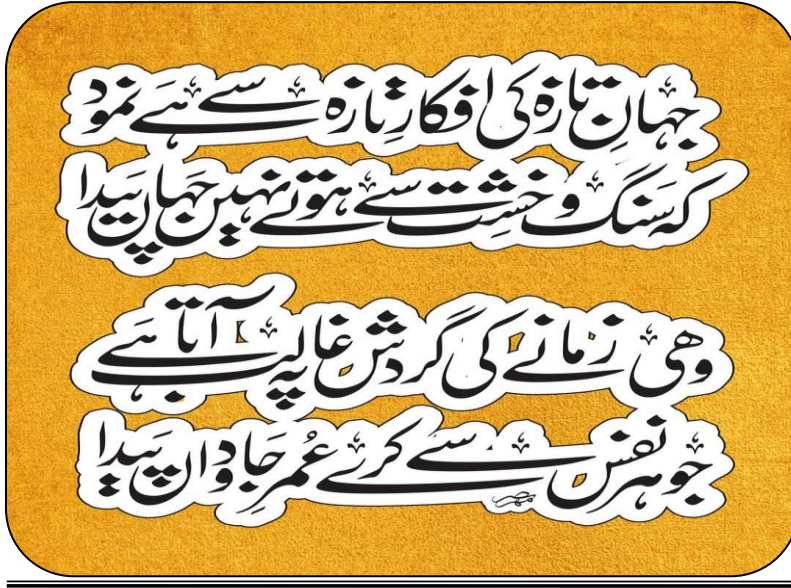
نسل پرستی کی وہ چنگاری جو دہائیوں سے امریکی آئین کی برابری اور برادری کی گارنٹیوں کی راکھ تلے سلگ رہی تھی، بلآخر شعلہ بن کر بھڑک اٹھی اور نا صرف "امریکا کلر بلائنڈ ہے" جیسے خوشنما نعروں کے حسن کو گہنا دیا، بلکہ زندگی، آزادی اور خوشی کے حصول جیسے اعلیٰ مقاصد کو بھی بے یقینی کی گمنام وادیوں کی نذر کر دیا۔

جارج فلائیڈ کے بے رحمانہ قتل سے کم از کم وقتی طور پر سہی، یہ تاثر مضبوط ہوا ہے کہ امریکی آئین کی لاکھ گارنٹیوں اور "امریکا کلر بلائنڈ" جیسے دلربا نعروں کے باوجود غیر سفید فام افراد بالخصوص کالوں کی نہ تو زندگی اور آزادی کی کوئی عملی ضمانت ہے، نہ ہی خوشی کا حصول ان کیلئے اتنا سہل ہے، جتنا کسی سفید فام کے لیے ہو سکتا ہے، یوں آپ کسی سفید فام سے نسل پرستی یا نسلی امتیاز کی بات کریں گے، تو وہ اس کو فوری طور پر جھٹلا دے گا اور بحث سے کترائے گا۔

اس طرح کے مباحث میں اس نوع کے جملے اکثر سننے کو ملتے ہیں، میرے تو کئی غیر سفید فام دوست ہیں، میں نے تو کبھی ان کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا، سفید فام براؤن اور کالے لوگوں سے شادیاں بھی کرتے ہیں، ہمارا آئین بھی اس کی ضمانت دیتا ہے اور نسلی امتیاز روا رکھنا قابل تعزیر ہے، وغیرہ وغیرہ۔

فرد کی سطح پر دیکھا جائے تو یہ بات کافی حد تک درست بھی معلوم ہوتی ہے، مگر جب سب ہی سفید فام یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ نسل پرست نہیں تو پھر یہ شور کیسا ہے؟ عمیق نگاہی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چند ایک شدت پسندوں کے سوا کوئی بھی نسل پرستی کی کھلے عام حمایت کرتا نظر نہیں آئے گا، مگر یہ امریکی اور یورپی معاشروں کی ایک ایسی تلخ حقیقت ہے، جس پر ان معاشروں کا فکر و نظر رکھنے والا طبقہ متفکر بھی نظر آتا ہے اور شرمندہ بھی۔

درحقیقت نسلی امتیاز کی جڑیں بہت گہری ہیں اور اس کا تانا باناان کے معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی نظام میں گندھا ہوا ہے، سفید فام لوگوں میں بے شمار لوگ سچے دل سے نسل پرستی کیخلاف ہیں اور ان میں سے کچھ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں، مگر وہ بھی اس سٹرکچرل(Structural)اور سسٹمک (systemic) نسل پرستی سے کسی نہ کسی طرح مستفید ہوتے ہیں۔

امریکی دانشور پیگی میکنٹوش اس کو مراعات سے لبالب ایسے بیگ سے تشبیہ دیتی ہیں، جس کا کوئی وزن بھی نہیں، لیکن پھر بھی وہ فوائد سے بھرا ہوتا ہے، مطلب یہ کہ سفید فام لوگوں کو بغیر کچھ کیے بیشمار مراعات اور سہولیات حاصل ہوتی ہیں، جن سے دوسری اقوام ہمیشہ محروم ہی رہتی ہیں۔

پیگی نے کم از کم پچاس ایسی غیر مرئی اور غیر محسوس مراعات کی ایک فہرست مرتب کی ہے، جو ہر سفید فام کو گود سے گور تک حاصل ہوتی ہیں، خواہ وہ اس سے آگاہ ہو یا نہ ہو، مثال کے طور پر صحت اور تعلیم کے حوالے سے سفید فام کو ان تفکرات کا سامنا نہیں ہوتا، جو غیر سفید فام کو، نیز تاریخ سے مراد سفید فام لوگوں کی تاریخ ہے اور چند سال قبل تک کالوں کی تاریخ پر مشکل سے کوئی کتاب دستیاب تھی اور سب

سے بڑھ کر یہ کہ سفید فام لوگوں کو اپنے بچوں کو یہ نہیں بتانا پڑتا کہ نسل پرستی کیا ہوتی ہے اور اس کے مضمرات کیا ہیں؟

نسلی برتری کے احساس کیلئے کسی سیاسی جماعت یا نازی ازم جیسے نظریے کا پیروکار ہونا ضروری نہیں اور نہ ہی اس کیلئے کسی باقاعدہ تعلیم یا تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، افراد کے اندر یہ احساس غیر محسوس طور پر آس پاس پھیلے ہوئے ثقافتی ماحول سے از خود سرایت کر آتا ہے۔

۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر کینتھ نے بچوں پر ایک تجربہ کیا، جس میں سیاہ فام بچوں کو سیاہ اور سفید گڑیاؤں میں سے انتخاب کرنا تھا، زیادہ بچوں نے سفید گڑیا کو پسند کیا، ۲۰۱۰ء میں یہی تجربہ دونوں نسل کے بچوں پر دُہرایا گیا اور نتائج وہی رہے، گویا انہی برسوں میں لاشعوری نسل پرستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

عام آدمی تو ایک طرف بڑے بڑے سیلیبرٹیز بھی نسلی امتیاز کی زد سے نہیں بچ سکے، معروف ٹینس سٹار سیرینا ولیم نے ایک مرتبہ غصے سے ریفری کو چور کہہ دیا، جس پر اس کو باقاعدہ تحریری سرزنش کا سامنا کرنا پڑا، جبکہ سفید فام جان مکینرو جو منہ پھٹ مشہور تھے، کھیل کے دوران اس سے بڑی بڑی بدتمیزیاں کر جاتے تھے، مگر ان کو کبھی کچھ نہ کہا گیا، اس بات کا اعتراف خود مکینرو نے بھی میڈیا کے سامنے کیا۔

نسلی امتیاز کا اظہار ایک اور طریقے سے بھی کیا جاتا ہے، جس کو ٹون پولیسنگ کہا جاتا ہے، غیر سفید فام لوگوں کو ان کے لب و لہجہ کی وجہ سے بھی غیر مہذب گردانا جاتا ہے، وہ اگر غصیلی آواز میں اپنی شکایت کا بھی اظہار کر دیں تو بھنویں تن جاتی ہیں اور اکثر اوقات ان کو اونچی آواز میں اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے پر بھی پر تشدد ہونے کے الزام کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسی طرح اگر کوئی غیر سفید فام شستہ گفتگو کرے یا دھیمے

اور مہذب لب و لہجے میں اپنے جذبات یا غصے کا اظہار کرے تو اس کو بڑی خوشگوار حیرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے، گویا کوئی انہونی ہو گئی ہو! یہ بذاتِ خود نسلی امتیاز کا ایک خفی انداز ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ سیاہ فام حضرات حقوق کی بات تو کرتے ہیں، لیکن اپنے آپ کو بہتر کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے، نوے فیصد سٹریٹ کرائمز سیاہ فام حضرات ہی کرتے ہیں، تعلیم میں بھی ان کی دلچسپی برائے نام ہے۔

مصنف کا ذاتی تجربہ ہے کہ نیویارک میں ان کی گلیوں سے گزرتے ہوئے خوف آتا ہے، آوارہ گرد لڑکوں کی منڈلیاں جگہ جگہ بیٹھی نظر آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ دیکھنے والے کے ذہن میں یہ چیزیں کوئی اچھا تاثر قائم نہیں کرتیں، یہاں تک کہ صدر اوباما تک یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ سیاہ فام لوگوں کو بھی اپنے کلچر میں تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔

یہ بات اس لیے بھی درست نظر آتی ہے کہ سیاہ فام کے خلاف مخاصمت کے جذبات جس قدر شدید نظر آتے ہیں، اس قدر کسی اور غیر سفید فام قومیت کیخلاف دکھائی نہیں دیتے، مثلاً ساؤتھ ایشیائی لوگوں کو اس طرح کے تعصب کا سامنا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ محنت سے اپنا کیریئر بناتے ہیں، اپنے رویے سے اپنے آپ کو پرامن ثابت کرتے ہیں اور کسی پر تشدد کارروائی کا حصہ بھی نہیں بنتے۔

ہمارے یہاں یہ عمومی رویہ ہے کہ مغرب میں ہمیں ذرا بھی خرابی نظر آجائے، ہم خوب اس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، لیکن اسی نوع کی خرابیاں ہمارے یہاں پائی جائیں تو آسانی سے نظر انداز کر دیتے ہیں، امریکا میں تو انسان گورے اور کالے میں ہی تقسیم ہیں، جبکہ ہمارے یہاں تو یہ تقسیم کثیر الجہتی ہے۔

سکول کے زمانے میں شاعر مشرق علامہ اقبال کی ایک نظم پڑھی تھی، جس کا عنوان تھا: "ایک آرزو"۔اس میں علامہ اقبال نے بڑی دلکش منظر کشی کرتے ہوئے کہاہے:

"دنیا کی محفلوں سے اکتا گیاہوں یارب!/کیالطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو/شورش سے بھاگتاہوں،دل ڈھونڈتاہے میرا/ایساسکوت جس پر تقریر بھی فداہو/مرتاہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری/دامن میں کوہ کے اک چھوٹاسا جھونپڑا ہو/آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں/دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو/لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں/چشمے کی شورشوں میں باجاسا بج رہاہو/گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا/ساغر ذراسا گویا مجھ کو جہاں نماہو/ہو ہاتھ کا سرہانا سبزے کا ہو بچھونا/شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ اداہو/مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل/ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مراہو/صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں/ندی کا صاف پانی تصویر لے رہاہو/ہو دل فریب ایسا کوہسار کا نظارہ/پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتاہو/آغوش میں زمیں کی سویاہواہو سبزہ/پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہاہو/پانی کو چھورہی ہو جھک

جھک کے گل کی ٹہنی / جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو / مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو / سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو / راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم / امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو / بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے / جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو / پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن / میں اس کا ہم نوا ہوں وہ میری ہم نوا ہو / کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں / روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو / پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے / رونا مرا وضو ہو نالہ مری دعا ہو / اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے / تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو / ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے / بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے!"۔

مذکورہ نظم مجھے ساری زندگی یاد آتی رہی، کیونکہ علامہ اقبال نے اس نظم میں جس چیز کی تمنا کی تھی، میٹرک تک ہماری زندگی اُسی ماحول میں گزری، روز سکول جاتے ہوئے ہمارا گزر ایسے ہی پہاڑی ندی نالوں سے ہوتا تھا اور وہ بعینہ علامہ اقبال کی آرزو کا مظہر تھے۔اب تو برسوں جانا نہیں ہوتا، جون تا اگست ہمارے آبائی گھر کے صحن میں بیٹھیں تو سامنے ایسا ہی رومانی منظر اور دلکش نظارہ ہوتا ہے اور ہریالی سے بھرپور پوری وادی ہتھیلی کی طرح نظروں کے سامنے ہوتی ہے۔

شاید علامہ اقبال دنیا کی محفلوں سے اکتا گئے تھے۔پس انہوں نے ایک تخیلاتی منظر اپنے ذہن میں سجالیا تھا، چنانچہ وہ اللہ کے حضور دعا کرتے ہیں، اے پروردگار! دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں، دل بجھ سا گیا ہے، شورش سے نفرت ہو گئی ہے، مجھے ایسا سکوت چاہیے کہ جس پر گفتار اور گویائی بھی قربان ہو جائے، میں خاموشی کے لیے مرا جا رہا ہوں، مجھے پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا چاہیے، جہاں میں ہر فکر سے آزاد ہو کر تنہائی میں دن گزاروں، دنیا کے غموں کو پیچھے چھوڑ آؤں، چڑیوں کی

چہچہاہٹ اور پہاڑی چشموں کی شورش میرے لیے نغمگی اور موسیقی کا سماں پیدا کرے، پھول کی کلی چٹکے تو میں ہمہ تن گوش ہو جاؤں، ندی کے کنارے قدرتی سبزہ زار بچھونے کا کام دے، ہاتھ سے ٹیک لگا کر لیٹ جاؤں، ایسی مثالی تنہائی ہو کہ جس کے آگے بزم بھی شرمائے، میری صورت سے بلبل اس قدر مانوس اور بے تکلف ہو جائے کہ وہ مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرے۔

پہاڑی ندی کا منظر یہ ہوتا ہے کہ جون تا اگست کے زمانے میں کثرت سے بارشیں ہوتی ہیں، پانی کا بہاؤ تیز ہوتا ہے، آبشار بن کر گرتا ہے، موجیں اٹھتی ہیں، ندی کے دونوں جانب ہرے بھرے درخت ہوتے ہیں، ہر سو سبزہ ہی سبزہ ہوتا ہے، پس اقبال کہتے ہیں، جب ندی کی موجیں بلند ہوتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ ہرے بھرے درختوں کی تصویر لے رہی ہیں، ایسا لگے کہ پانی کی موجیں اٹھ اٹھ کر پہاڑ کا نظارہ کر رہی ہیں، ہرے بھرے سبزے کو زمین نے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے اور پھولوں کی جھکی ہوئی ٹہنیاں پانی کو اس طرح چھو رہی ہوں جیسے کوئی حسین آئینہ دیکھتا ہے، سر شام جب اُفق پہ سرخی چھا جائے تو ایسا لگے کہ جیسے دلہن کو مہندی لگا کر سجایا گیا ہے۔

وہ مزید کہتے ہیں پہاڑی پگڈنڈیوں پر راتوں کو سفر کرنے والے جب تھک ہار جائیں تو میری جھونپڑی میں ٹمٹماتا ہوا دِیا، اُن کے لیے امید کی کرن بنے، جب آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوں اور بجلی چمکے تو مسافروں کی نظر میری کٹیا پر پڑے، رات کے پچھلے پہر کوئل کی کوک اذانِ فجر کا کام دے اور ہم دونوں حمدِ باری تعالیٰ میں یک آواز ہو جائیں، میری ساعت کسی کے زیرِ بارِ احسان نہ ہو، میری جھونپڑی کے روزن سے جب روشنی کی کرن آئے تو مجھے صبح کا پتا چلے، جب رات کے وقت شبنم پھولوں کو

وضو کرانے آئے تو میرے آنسو میرا وضو بن جائیں اور میری فریاد میری دعا بن جائے، اس پر سکون ماحول میں اللہ کے حضور میری فریاد اتنی بلند ہو کہ تاروں کے قافلے بھی سن کر سہم جائیں، میرے رونے سے ہر دردمند دل رو پڑے "کاش کہ جو خواب غفلت میں پڑے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں جگادے۔ غالب نے بھی کہا ہے

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار' تو کوئی نہ ہو تیماردار اور اگر مر جایئے' تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

امیر مینائی نے بھی کچھ اس سے ملتی جلتی خواہشات کا اظہار کیا تھا، یہ خیال اس لیے آیا کہ علامہ اقبال نے تو ایک اختیاری خَلوت گزینی اور عُزلت نشینی کی تمنا کی تھی، مگر کورونا وائرس کے سبب لاک ڈاؤن نے سب پر یہ جبری خَلوت مسلّط کر دی، یورپ کے بارے میں تو یہ خبر آئی کہ گھریلو جھگڑے ہونے لگے، گھریلو تشدد میں اضافہ ہوا، کیونکہ وہ زیادہ دیر مل جل کر رہنے کے عادی نہیں رہے۔

پس کچھ باذوق لوگوں کو چاہیے کہ خانہ بدوش بنیں، جنہیں مغرب میں Gypsies کہا جاتا ہے، وہ مستقل ٹھکانا بنانے کے عادی نہیں ہوتے، چلتے پھرتے جہاں رات آئی بسر کر لی، یہ بڑا اچھا موسم ہے، اگر کچھ لوگ خانہ بدوش بن کر سوات اور ہزارہ کے پہاڑی علاقوں کا رخ کریں، ندی نالوں کا نظارہ کریں، تو علامہ اقبال کی آرزو آپ کو مجسم نظر آئے، آج کل وہاں وہ تمام نظارے دستیاب ہیں، جن کی اقبال نے بڑی چاہ سے تمنا کی تھی، اقبال کے اجداد کشمیر سے آئے تھے، اس لیے کشمیر کے حسین مناظر شاید ان کی جینیاتی ساخت میں شامل تھے، کسی صاحبِ نظر نے کشمیر کے بارے میں کہا ہے

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

مفہوم: یعنی بفرضِ محال اگر جنت زمین پر ہوتی تو صرف اور صرف کشمیر ہی میں ہوتی کیونکہ یہ وادیِ جنت نظیر ہے۔

خواہش اپنی اپنی ہوتی ہے، مولانا حسن رضا خان نے بھی ایک مثالی خَلوت کی تمنا کرتے ہوئے کہا ہے

دل میں ہو یاد تیری اور گوشۂ تنہائی ہو پھر تو خَلوت میں بھی عجب انجمن آرائی ہو

بند جب خوابِ اَجل سے ہوں آنکھیں اس کی نظروں میں تیرا جلوۂ زیبائی ہو

مفہوم: یارسول اللہ! گوشۂ تنہائی ہو اور دل میں آپ کی یاد رچی بسی ہو تو پھر خَلوت میں بھی ایک مثالی بزم سجے گی اور جب فرشتۂ اَجل آکر میری روح قبض کرے تو آخری صورت جو نگاہوں میں قرار پائی ہو، یارسول اللہ! وہ آپ کے دیدار کا جلوۂ زیبا ہو"۔اس پر علامہ سید محمد نعیم الدین مرادآبادی نے کہا:

سارا عالم ہو، مگر دیدۂ دل دیکھے تمہیں انجمن گرم ہو اور لذّتِ تنہائی ہو

مفہوم: یارسول اللہ! سارے عالم کی بزم اپنی پوری تاب وتواں اور رنگینیوں ورعنائیوں کے ساتھ سجی ہوئی ہو، لیکن نہ کوئی منظر آنکھوں میں جچے، نہ دل میں بسے، نہ کسی چیز سے دل لگے، بس یہی تمنا ہے کہ دیدۂ دل میں آپ کی یاد رچی بسی ہو اور آپ ہی کے تصور کو ساتھ لے کر ایک نورانی انجمن سے لطف اندوز ہوتا رہوں۔

ٹڈی دل کا حملہ

ڈاکٹر ابراھیم مغل

وطنِ عزیز میں جہاں دیگر قدرتی آفات فصلوں اور باغات کو وقتاً فوقتاً نقصان پہنچاتی رہتی ہیں، وہیں ایک بڑی آفت ٹڈی دل کی یلغار ہے، بد قسمتی سے اس وقت ملک کے زرعی رقبے کا بڑا حصہ ٹڈی دل کے غولوں کی زد میں ہے، نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی کے مطابق ملک کے کل ۱۵۴ اضلاع میں سے ۶۱ میں اس وقت ٹڈی دَل کے نشانے پر ہیں۔

دوسری جانب یہ بتایا جارہا ہے کہ افریقہ کی طرف سے ٹڈیوں کے مزید غول پاکستان کی طرف بڑھ رہے ہیں اور ان کے امسال جون، جولائی تک یہاں پہنچ جانے کا اندیشہ ہے، اس طرح پہلے سے موجود ٹڈی دَل کے ساتھ جب یہ نئے غول بھی مل جائیں گے تو زرعی پیداوار اور سبزے کے لیے غیر معمولی تباہی برپا کر سکتے ہیں۔

خوراک کے تحفظ، مویشیوں کی بقا اور سماج کے کمزور طبقات کے لیے یہ صورتحال تباہ کن ہو سکتی ہے، اقوام متحدہ کے ادارہ برائے خوراک و زراعت نے رواں ماہ کے شروع میں ایک رپورٹ میں بتایا تھا کہ جاری سال میں پاکستان میں ٹڈی دَل کی وجہ سے ربیع اور خریف کی فصلوں کا مجموعی نقصان چار ارب ڈالر تک پہنچ سکتا ہے، اس رپورٹ میں ربیع کی فصلوں کے نقصان کا اندازہ مجموعی مالیت کے ۱۵ فیصد کے برابر یا ۲۰۵ ارب روپے کے قریب جبکہ خریف کی فصلوں کے

نقصان کا تخمینہ ۲۵ فیصد یا ۴۶۴ ارب روپے لگایا گیا ہے، کیا یہ نقصان اسی تخمینے تک محدود رہے گا، کم ہو گا یا بڑھ جائے گا؟ اس کا انحصار ٹڈیوں کی یلغار، رخ اور ہمارے اداروں کی دفاعی حکمت عملی پر ہو گا۔

ٹڈی دَل کا دوسرے سال میں یہ دوسرا حملہ ہے، گزشتہ برس شروع ہونے والا حملہ رواں سال کے آغاز تک جاری رہا اور اس دوران ہماری حکومت کے متعلقہ ادارے اس خطرے کے ساتھ پوری طرح نمٹنے میں ناکام رہے، بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ حملے کئی برس کے وقفے کے بعد ہوئے تھے اور اس دوران ہمارے پلانٹ پروٹیکشن ادارے کی اس حوالے سے تیاری تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی، اس ایک برس کے اور ٹڈی دَل کی دوسری یلغار کے باوجود تیاری میں فی الحال کوئی فرق واضح نہیں ہوا، مگر اس برس پہلے سے شدید حملے کا اندیشہ ضرور ہے، ایسی صورت میں کیا ہو گا؟ بادی النظر میں ایک ہی امکان واضح دکھائی دے رہا ہے اور وہ وسیع رقبے پر زرعی پیداوار اور سبزے کی تباہی اور غربت و بدحالی میں اضافے کا ہے۔

ہمارے ہاں یہ وتیرہ بن چکا ہے کہ جب تک حالات گھمبیر صورت اختیار نہ کریں اور جب تک پانی گردن تک نہ پہنچ جائے اور سانس لینے میں دشواری نہ پیش آنے لگے، ہمارے ادارے ٹس سے مس نہیں ہوتے اور جب پانی سر سے گزرنے لگتا ہے تو ہنگامی اقدامات کے لیے دوڑ لگا دی جاتی ہے۔

پہلے ٹڈی دَل کے حوالے سے یہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹڈی دَل ایک بڑا خطرہ بن چکا ہے، اس طرح کورونا وائرس کی وجہ سے آنے والی کساد بازاری اور معاشی مواقع کے تنزل کے ساتھ ٹڈی دَل کے حملوں کے معاشی اثرات مزید گھمبیر صورت اختیار کر جائیں گے، فوڈ سیکورٹی کا مسئلہ، جس کی جانب اقوام متحدہ کے ادارہ برائے خوراک و زراعت نے بھی اشارہ کیا ہے، ان حالات میں

ناقابل برداشت منفی اثرات مرتب کر سکتا ہے، ٹڈی دَل کی یلغار جس تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کے مقابلے میں ہماری حکومت کی انسداد حکمت عملی غیر مؤثر اور محدود دکھائی دے رہی ہے۔

حکومت کے اپنے اداروں کے مطابق ملک کا نصف کے قریب رقبہ ٹڈی دَل کے نشانے پر ہے، مگر انسدادی کارروائیاں چند علاقوں تک محدود ہیں جبکہ زیادہ تر علاقوں میں غریب کاشتکار اپنی مدد آپ کے تحت ٹڈیوں کو بھگانے کے جتن کر رہے ہیں، یہ طریقے انتہائی دقیانوسی ہیں، جیسے ڈھولچیوں کے ذریعے ڈھول بجوا کر اس کے شور سے ٹڈی دل کو منتشر کرنا، اس سے ذہن میں ایک معصوم سا سوال یہ ابھرتا ہے کہ اگر شور برپا کر کے ٹڈی دل کو یوں منتشر کیا جاسکتا ہے تو محکمہ زراعت اس تکنیک سے فائدہ اٹھانے کے لیے کیوں سائنس کی مدد سے کوئی جدید طریقہ استعمال نہیں کرتا؟ یقین کیا جاسکتا ہے کہ اس کے لیے کسی لمبے چوڑے بجٹ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

مگر یہاں تو وہ جو کہتے ہیں کہ 'اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو' کا سا عالم طاری ہے، ایسے میں عقلِ سلیم یہ سوچنے پہ مجبور رہے کہ آخر اس آفت کا ازالہ کیونکر ممکن ہے؟ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے خوراک و زراعت کے مطابق پاکستان نے گزشتہ برس آنے والی ٹڈیوں کا صفایا کرنے کے لیے جو سست اور ناکام حکمت عملی اپنائی اسی کا نتیجہ ہے کہ پاکستان میں مقامی سطح پر بھی ٹڈیوں کی افزائش کی رفتار کافی تیز ہے اور باہر سے نئے جھنڈ بھی پاکستان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

وزیراعظم کی جانب سے رواں سال جنوری میں ٹڈی دَل کے انسداد کے لیے ایکشن پلان تشکیل دیا گیا اور فروری میں وفاقی حکومت نے ٹڈی دَل کا صفایا کرنے کے لیے ایمرجنسی کا اعلان بھی کر دیا تھا، مگر اس عرصے میں اس آفت سے نمٹنے کے

لیے کیے جانے والے عملی اقدامات سے واضح ہو جاتا ہے کہ حکومت اس مسئلے کے اثرات کا اب بھی درست احاطہ نہیں کر رہی جس کا خمیازہ بھی ہمیں ہی بھگتنا پڑے گا۔

ہمارے ہاں یہ رواج بن چکا ہے کہ وقت پر حرکت نہیں کرنی اور بے وقت نعرے بازی کرتے رہنا ہے، ابھی چند ہفتے پہلے جب سندھ کے وزرا ٹڈی دَل کا شور مچا رہے تھے تو بعض اعلیٰ حکومتی حلقوں کی جانب سے یہاں تک کہا گیا کہ ٹڈی دَل کے خطرے کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے، مگر خطرہ نہ پہلے کسی سے پوچھ کر آیا تھا، نہ اب پوچھ کر آئے گا۔

ہم وقتی طور پر حقائق سے آنکھیں چرا سکتے ہیں مگر اس سے زمینی حقائق بدل نہیں جائیں گے، اقوام متحدہ کے ادارے برائے خوراک و زراعت کے مطابق ۴۰ لاکھ ٹڈیوں کا ایک جھنڈ ۳۵ ہزار افراد کی خوراک تباہ کر سکتا ہے، ہماری حکومت کو یہ تخمینے اور اعداد و شمار خطرے کی گھنٹی کے طور پر لینے چاہئیں۔

یہ واضح ہے کہ اب بھی اگر ہم نے ہوش کے ناخن نہ لیے تو آنے والے دن ہمارے مسائل میں اضافے کی خبر دے رہے ہوں گے، ضرورت اس امر کی ہے کہ ٹڈی دَل کے خطرے کا منظم انداز میں تخمینہ لگایا جائے اور ٹڈیوں کے ان لشکروں کا بھی جو افریقہ سے پاکستان کی جانب بڑھ رہے ہیں اور پھر ان کے سدِ باب کے لیے جامع منصوبہ بندی کے ساتھ کوششیں کی جائیں۔

اس حوالے سے کوششیں کرتے ہوئے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ محض موجود ٹڈیوں کا خاتمہ ہی کافی نہ ہوگا، ٹڈی دَلوں کی اس وقت تک مکمل بیخ کنی ممکن نہیں جب تک ان کے دیئے گئے انڈوں کو بھی تلف نہیں کیا جائے گا، اب بھی وقت ہے کہ جامع پالیسی وضع کی جائے اور اس پر عمل درآمد کیا جائے، ورنہ بہت زیادہ دیر ہو جائے گی۔

مغرب کو اپنے مہذب متمدن اور کلچرڈ ہونے پر بڑا زعم ہے، ہم مسلمانوں کو جاہل گنوار غیر مہذب اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں مگر ان کی تہذیب نسل پرستی کے حوالے سے دم توڑ جاتی ہے۔ اسلام میں ارشاد ہے گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی برتری نہیں، سوائے تقویٰ کے۔

یہ صرف زبانی کلامی نہیں بلکہ اس کے مظاہر اس ارشاد کے آغاز کے بعد سے ہی نظر آنے لگے تھے اور اب بھی نظر آتے ہیں مگر مہذب مغربی دنیا میں جو ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے شرمناک ہی نہیں انسانیت کی گراوٹ کی بد ترین مثالوں میں سے ہے، گورے کالوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور کہیں تو اس جرم بے گناہی میں کالوں کی جان بھی لے لیتے ہیں، تاہم تمام گوروں کو ایک ہی درجے میں بند نہیں کیا جا سکتا، ان میں اچھے بھی ہونگے، ایک ایسے ہی واقعہ نے مغرب کا مہذب چہرہ داغدار کر کے رکھ دیا ہے۔

امریکہ میں گورے پولیس مین نے ایک کالے کو سگریٹ چوری کے الزام میں پکڑا، اس کو زمین پر گرایا اور اس کی گردن پر گھٹنا رکھ دیا، جارج فلائیڈ نے بار بار کہا اس کا سانس بند ہو رہا ہے مگر بے رحم گورے نے گھٹنے کا دباؤ مزید بڑھا دیا تاآنکہ فلائیڈ

دم گھٹنے سے موت کی وادی میں اتر گیا، یہ کسی کی بد قسمتی تھی کہ ایک نہیں دو نہیں، سات کیمرے چل رہے تھے۔ویڈیو بن گئی اور وائرل بھی ہو گئی۔ویڈیو نہ بنتی تو فلائیڈ کی زندگی بے مول رہتی۔ ویڈیو نے امریکہ میں آگ لگا دی، لوگ مشتعل ہو گئے،کالوں کا ساتھ گوروں نے بھی دیا۔

امریکہ میں لگنے والی احتجاج اور اشتعال کی یہ آگ پوری دنیا میں پھیل گئی، صدر ٹرمپ کے خلاف نفرت کا ایک طوفان اُمڈ آیا،امریکہ میں امن وامان کی صورتِ حال بد تر ہو گئی۔ایک موقع پر صدر ٹرمپ کو حفاظت کے لیے بنکر میں منتقل ہونا پڑا، جنگ کے دوران کنکریٹ کے بنکر میں انتہائی حفاظت کے نکتہ نظر سے ایمر جنسی کی صورت میں کسی کو منتقل کیا جاتا ہے اور پھر ٹرمپ کی حفاظت اور وائٹ ہاؤس کو محفوظ رکھنے کے لیے وائٹ ہاؤس کی روشنیاں بھی ایک رات بند کرنا پڑیں،ایسا امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار ہوا۔

امریکیوں کا جارج فلائیڈ کی موت پر غصہ کم نہیں ہو رہا،اب تو اس واقعہ کے اثرات امریکہ میں صدارتی الیکشن پر بھی مرتب ہوتے نظر آرہے ہیں،ٹرمپ نے اپنی جیت کے لیے راہیں ہموار کرنے کی کوشش کی تھی،اس نے امریکیوں کیساتھ افغانستان سے اپنے فوجیوں کی بحفاظت واپسی کا وعدہ کیااور طالبان کے ساتھ ایک معاہدہ پر اتفاق کر لیا،امریکی ٹرمپ کے اس اقدام کے معترف تھے۔

ٹرمپ کی صدارتی انتخابات میں جو نومبر ۲۰۲۰ میں ہونے ہیں،کامیابی کے امکانات طالبان کے ساتھ معاہدے سے روشن ہو گئے تھے مگر ان امکانات پر فلائیڈ کے قتل کے بعد تاریکی کے دُبیز پردے پڑ گئے ہیں،اس سے ٹرمپ پریشان ہیں،اب وہ یوسف بے کارواں کی طرح نظر آتے ہیں۔فلائیڈ ایسا ہی ایک واقعہ چند سال قبل تیونس میں بھی پیش آیا تھا، جب ایک تعلیم یافتہ نوجوان ریڑھی والے کو پولیس نے

تشدد کر کے ہلاک کر دیا تھا۔اس پر تیونس میں مظاہرے شروع ہوئے اور تیونس کے صدر زین العابدین بن علی کو اقتدار تیاگ کر ملک سے فرار ہونا پڑا تھا،انہیں ہمارے نواز شریف یوگنڈا کے عدی امین کی طرح پناہ سعودی عرب میں ملی تھی،زین العابدین بن علی جنوری ۲۰۱۱ء کے اوائل میں اپنی حکومت کے خلاف عوامی احتجاجی تحریک کے بعد تیونس سے راہِ فرار اختیار کر کے سعودی عرب چلے گئے تھے اور وہ تب سے ساحلی شہر جدہ میں مقیم تھے،تاآنکہ گزشتہ سال جدہ میں انتقال کر گئے،ان کے فرار کے بعد احتجاج اور اشتعال بھی تیونس سے باہر پھیلتا چلا گیا جس نے عرب سپر نگ کی شکل اختیار کر لی، لیبیا کے کرنل قذافی اس کی بھینٹ چڑھے ، مصر کے حسنی مبارک بھی عرب بہار کی آگ کے شعلوں سے محفوظ نہ رہ سکے، عرب سپر نگ کی آگ نے بحرین شام اور یمن کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔

فلائیڈ کی موت دیکھیں کس کس کے اقتدار کو بھسم کرتی ہے، سر دست تو صدر ٹرمپ کا اقتدار لرزہ بر اندام ہےاور یہ ہمارے جیسے ممالک کے حکمرانوں کیلئے بھی وارننگ ہے کہ کسی بھی شخص کو حقیر نہ جانا جائے،کسی کو ستم کا نشانہ بنایا جائے اور نہ ہی بننے دیا جائے جس کے کبھی کبھی نتائج بھیانک بھی ہو سکتے ہیں، مگر ہم پاکستانیوں کی شاید ڈھیٹ ہڈی ہے، سانحہ ماڈل ٹاؤن،سانحہ ساہیوال جیسے واقعات بھی تاریخ کی گرد میں دب گئے،بلدیہ ٹاؤن کراچی کے تین سوآگ میں کوئلہ ہونے والے مزدوروں کی روحیں اور ان کے لواحقین آج بھی انصاف طلب ہیں،لاہور کے ایل ڈی اے پلازہ میں بھی آگ لگی تھی اوراس طرح کی آگ نے کئی بار بہت سے ریکارڈ اور ہیر پھیر کے ثبوت جلادیئے مگر انصاف کے متلاشیوں کی آہیں اور سسکیاں عرش سے ٹکرا کر واپس آجاتی رہیں، مگر شاید کبھی یہ عرش میں ارتعاش پیدا کر دیں لہٰذا ظالم اُس وقت سے ڈریں۔

علم طب کے فروغ میں جہاں صاحبان علم و فضل اطباء کا کردار یادگار اور ناقابل فراموش ہے، وہیں جڑی بوٹیوں کی تلاش اور خصوصیات کے حوالے سے عطائیوں کی عرق ریزی سے بھی انکار ممکن نہیں، کہا جاتا ہے کہ انہی عطائیوں نے اپنی زندگیاں جڑی بوٹیوں کی پہچان، ان کے خواص اور استعمال کے بارے میں جانتے جانتے جنگلوں ویرانوں، میدانوں اور پہاڑوں میں تیاگ دیں۔

۳۰ سال قبل جڑی بوٹیوں کے ایک عمر رسیدہ عطائی سے ملاقات میں نباتات کے مفید اور مضر اثرات سے واقفیت کے بارے میں پوچھا تو اس نے دھیرے سے کہا کہ ہمیں یہ جڑی بوٹیاں خود بول کر اپنے مفید اور مضر اثرات بتاتی ہیں۔

اس وقت اس بابے کی یہ بات ایک ''دیوانے کی بڑ'' سے زیادہ کچھ نہ لگی لیکن دوران مطب ایک لاعـلاج، انتہائی نازک اور قریب المرگ مریض کا علاج کرتے ہوئے جب ہم آٹھوں پہر اسی مریض کے مرض کے بارے ہی میں سوچا کرتے تھے تو دوران عـلاج تین بار مختلف ادویات خواب میں منکشف ہوئیں جو کہ ۱۰۰ فیصد موثر اور مفیـد ثابت ہوئیں، تب ہمیں اس سنیاسی بابے کی باتوں میں چھپی سچائی کا یقین ہوا۔

ہمارے ہاں فی زمانہ لفظ ''اتائی'' بڑی کثرت سے بولا جانے لگا ہے، بعض لوگ ''اتائی'' اور'' عطائی'' کے مفہوم و معانی جانے بغیر ہی اچھے خاصے علم و فضل سے مالا مال فرد پر بھی ''اتائی'' ہونے کا بہتان لگادیتے ہیں حالانکہ ''اتائی'' اور'' عطائی'' کے معانی و مفہوم پر غور کیا جائے تو لاعلمی اور بے دھیانی کے کئی پردے چاک ہو جاتے ہیں۔'اتائی' کے لغوی معانی ایک ایسے اناڑی کے ہیں جو کسی بھی شعبے یا پیشے کی فنی تعلیم و تربیت حاصل کیے بغیر اس کی پریکٹس کرتا ہو۔

ہمارے ہاں عجیب و غریب رویے دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ایک خاص مائینڈ سیٹ کے تحت طب اور طبیب کے بغض میں لتھڑی ہوئی سوچ کے حاملین صرف شعبہ طب سے منسلک افراد کو'' اتائی ''قرار دیتے ہیں، انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ شعبہ طب کے علاوہ دیگر تمام شعبہ ہائے زندگی میں گھسی کالی بھیڑوں کے لیے بھی ''اتائی'' کا لفظ بولا جائے، بعض لوگ نہ صرف جعلی حکیموں کو 'اتائی' کہتے ہیں بلکہ بعض اوقات مستند، رجسٹرڈ اور محکمہ صحت کے تمام قوائد و ضوابط پر عمل پیرا، پڑھے لکھے ہزاروں اطباء کو بھی ''اتائی'' اور ''نیم حکیم'' کہہ کر پیغمبرانہ پیشے اور الہامی علم کی توہین کرتے ہیں۔

اتائی سے ملتے جلتے اور مشابہہ لفظ ''عطائی'' کا مفہوم 'عطا کیا گیا'، 'دیا ہوا'، 'بخشش' اور 'سخاوت' ہے۔ لغات کے مطابق ''عطائی ''ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جس نے کسی استاد کے پاس بیٹھ کر کسی ہنر، پیشے یا فن سیکھنے کی عملی کوشش متواتر، ایک مخصوص مدت تک کی ہو، اور اس کے استاد نے اسکی فنی مہارت کو جانچنے و پرکھنے کے بعد اسے اس فن، ہنر یا پیشے کی پریکٹس کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہو۔

تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو شعبہ طب کے ساتھ ساتھ ادب و صحافت، شاعری، فن موسیقی، فن مصوری، فن تعمیر اور زندگی سے وابستہ تمام علوم و فنون کی ترویج و

فروغ کا سبب عطائیت ہی ہے، ماضی کے نامور اکابرین و اسلاف کی علمی، و فنی تمام تر صلاحیتوں کا دار و مدار اور انحصار اسی "عطائیت" کے بل بوتے پر تھا، ابتدائے انسان سے لے کر مہذب اور متمدن زندگی سے پہلے تمام علوم و فنون ایک سے دوسرے فرد میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے ہیں۔

بڑی بڑی درس گاہیں اور علمی اداروں کا قیام تو بہت بعد میں وجود میں آیا، اگر "عطائیت" کو اتنا ہی انسان دشمن مان لیا جائے جتنا کہ آج کل اسے ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے تو پھر فی زمانہ رائج الوقت تمام علوم و فنون کی اہمیت، حقانیت اور صداقت سے انکار کرتے ہوئے انھیں متروک قرار دینا چاہیے۔

کورونا وائرس نے دنیا بھر میں انسانوں کی نہ صرف صحت کے معاملات کو ہلا کے رکھ دیا ہے بلکہ طبّی، معاشی، جدید آلاتی، سائنسی، فلاحی، سماجی، نفسیاتی اور ماحولیاتی لحاظ سے بھی نئی جہتوں پر سوچنے کا موقع فراہم کیا ہے، اسے اتفاق ہی سمجھنا چاہیے کہ گزشتہ چند دہائیوں سے پوری دنیا اپنی جدید ترقی کے زعم میں فطری طرز علاج اور متبادل ادویات کو پس پشت ڈالنے کی روش پر عمل پیرا تھی، کورونا کے حملے نے جدید اور ترقی یافتہ اقوام کو فطرت اور فطری طرز علاج سے دوبارہ متعارف کروا دیا ہے کیونکہ کورونا کے اثرات سے مبینہ بچاؤ کے حوالے سے جدید میڈیکل سائنس کے پاس سوائے وینٹیلیٹر اور آکسیجن کے کوئی دوسرا آپشن موجود نہیں۔

اس کے برعکس طب قدیم اور قدرتی نباتات کے ماہرین کے مطابق جڑی بوٹیوں میں کورونا وائرس کی شدت کم کرنے اور اس کے مضر اثرات زائل کرنے کی صلاحیت اتم درجہ پائی جاتی ہے۔

اس حوالے سے دنیا بھر کے نیچرو پیتھ اور نباتات کے ماہرین وقتاً فوقتاً اپنی ماہرانہ آراء اظہار کرتے رہے ہیں لیکن اس نازک اور مشکل صورتحال میں ہمیں "اتائیت"

کا سامنا بھی رہا ہے، بہت سے ایسے ٹوٹکے ہیں جن کی طبّی حیثیت کسی درجے میں بھی نہیں مانی جا سکتی جیسا کہ کہا گیا "پیاز کھانے سے کورونا سے نجات ملتی ہے"،لیکن طبّی ماہرین نے اس مفروضے کو رد کر دیا،اس طرح کے لاتعداد ٹوٹکے نان پروفیشنلز کی جانب سے منظر عام پر آتے رہے اور سمجھدار لوگ ماہرین سے ان کے بارے میں استفسار کرتے رہے۔

دریں حالات بہت سی مفید قدرتی گھریلو تراکیب بھی وائرل ہوئیں اور عوام الناس نے ان سے خاطر خواہ استفادہ بھی کیا، کئی نام نہاد "ماہرین" کی جانب سے کورونا کا علاج دریافت کرنے کے دعوے بھی سامنے آئے، اس حوالے سے سوشل میڈیا پر ان "ماہرین" کی کافی جگ ہنسائی بھی ہوئی۔

کورونا وائرس کے خاتمے بارے کوئی حتمی رائے نہیں جا سکتی اور نہ ہی اس وباء کے ختم ہونے کی مدت کا تعین کیا جانا ممکن ہے،آج کل ایک قدرتی نبات "سنا مکی" کے قہوے کے سوشل میڈیا پر بہت چرچے ہیں، کہا جا رہا ہے کہ کورونا میں مبتلا مریض سنا مکی کا قہوہ پینے سے چند گھنٹوں میں صحت یاب ہو جاتا ہے، طب کے طالب علم کے طور پر چند وضاحتیں ضروری ہیں تا کہ عوام الناس "بھیڑ چال" سے بچ کر اپنی زندگی، صحت اور وقت کے ضیاع سے بچیں۔

سنا مکی کو طبّی ماہرین کے ہاں صدیوں سے بطور مسہل یعنی اجابت کی بہ سہولت فراغت کے لیے استعمال کروایا جاتا رہا ہے، سنا مکی بدن انسانی سے بڑھے ہوئے اخلاط بلغم، صفراء اور سودا کو چھانٹ کر بول و براز کے راستے خارج کر دیتی ہے، یہ انتڑیوں میں رکاوٹ بننے والی آلائشوں سے بھی انہیں صاف کرتی ہے، زہریلے اور فاسد مادوں کو بدن سے نکال کر خون کو بھی صاف بناتی ہے، سنا مکی پیٹ کے کیڑوں کو بھی مار کر

نکال دیتی ہے، یہ غلبہ بلغم، سودا اور صفراء کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی علامات میں بھی افاقہ کا سبب بنتی ہے، پھیپھڑوں میں جمی بلغم کو خارج کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے، مسہل ہونے کے باعث سنا مکی استعمال کرنے سے قبض کے مریضوں پر اچھے اثرات مرتب کرتی ہے، طبیعت ہلکی، چست اور محرک ہو جاتی ہے۔

فوائد کے ساتھ ساتھ سنا مکی پیٹ میں مروڑ، درد، متلی اور قے کی کیفیت بھی پیدا کرنے کا باعث بن سکتی ہے، طبّی ماہرین نے اس کی خوراک عمر کی مطابق ایک سے پانچ گرام تک متعین کی ہے، یاد رہے کہ مقررہ مقدار سے زیادہ استعمال کرنے سے مذکورہ منفی اثرات ظاہر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ سنا مکی کے بہترین استعمال کے حوالے سے ماہرین نے اس کا خیساندہ زیادہ موثر قرار دیا ہے جس کی ترکیب یہ ہے:

سنا مکی ایک گرام، ادرک کی قاشیں نصف گرام اور گلاب کی چند پتیاں ایک کپ ابلتے ہوئے گرم پانی میں ڈال کر کپ کو دس سے پندرہ منٹ تک ڈھانپ کر رکھ چھوڑیں، وقت مقررہ پورا ہونے کے بعد پانی کو صاف کر کے خالص شہد ایک چمچ ملا کر پی لیا جائے تو یہ فوائد کثیرہ کا سبب ہے، اسی طرح سنا مکی ایک گرام، منقّٰی ے عدد اور گلاب کی چند پتیاں ایک کپ پانی میں تھوڑا سا پکا کر بطور قہوہ پیا جائے تو بہترین دوا ثابت ہوتی ہے۔

سنا مکی، سونٹھ اور دیسی شکر ہم وزن ملا کر سفوف بنا لیں اور رات سوتے وقت آدھا چمچ سے ایک چمچ تک نیم گرم پانی سے استعمال کریں، بدن کے بادی سے جڑی تمام امراض کا خاتمہ ہو جائے گا، سنا مکی کو تنہا استعمال کرنے سے طبّی ماہرین نے منع کیا ہے کیونکہ صرف سنا مکی استعمال کرنے سے پیٹ میں مروڑ، درد، متلی اور قے آنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح مقرر کردہ مقدار خوراک سے زیادہ استعمال

کرنے اسہال آنے لگتے ہیں، بار بار پاخانہ آنے سے انتڑیاں متاثر بھی ہوتی ہیں اور بدن سے پانی کی مقدار کے کم ہونے کا خطرہ بھی رہتا ہے۔ لہٰذا زیادہ بہتر اور مناسب طرز عمل یہی ہے کہ کسی ماہر معالج سے مشاورت کرنے کے بعد اس کی مقدار خوراک اور طریقہ اپنایا جائے۔

سوشل میڈیا پر دکھائی دینے والی اکثر معلومات بے سر و پا ہی ہوتی ہیں، صحت کے حوالے سے محتاط رہنا بڑا ضروری ہے، ہلکی سی کوتاہی اور لاپرواہی کسی بڑے سانحہ کا سبب بن سکتی ہے، جس طرح ہم لباس، جوتے اور خوبصورتی کے دوسرے لوازمات خریدتے وقت برانڈ اور کوالٹی پر سمجھوتہ نہیں کرتے بالکل اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر صحت اور تن درستی سے جڑے عوامل پر کبھی کمپرومائزنہ کریں، جس بدن کی ظاہری کشش اور دل کشی کے لیے ہم اتنی محنت اور پیسہ خرچ کرتے ہیں لیکن کس قدر نادانی ہے کہ اسی بدن کی تن درستی کے لیے ہم سنی سنائے اور ''مفت'' کے ٹوٹکوں پر انحصار ہیں۔ زیب وزینت کے اخراجات سے نصف بھی اپنی صحت پر خرچ کر لیا جائے تو انسان کی زندگی سنور جائے۔

- ماں کی آنکھوں سے ہمیشہ محبت ٹپکتی ہے جبکہ باپ آنکھوں سے اظہار کیے بغیر محبت کرتا ہے۔
- ماں زندگی بخشتی ہے جبکہ باپ جینے کا سلیقہ عطا کرتا ہے۔
- ماں روٹی اور کھانا کھلاتی ہے جبکہ باپ روٹی اور کھانے کی قیمت کا احساس دلاتا ہے۔
- ماں دنیا سے متعارف کرواتی ہے جبکہ باپ دنیا کو آپ سے متعارف کرواتا ہے۔
- ماں اپنی ذات پہ توجہ رکھنا سکھاتی ہے جبکہ باپ ذمہ داریوں پہ توجہ رکھنا سکھاتا ہے۔
- ماں گرنے سے بچاتی ہے جبکہ باپ گر کر سنبھلنا سکھاتا ہے۔
- ماں پیروں پہ چلنا سکھاتی ہے جبکہ باپ زندگی کے نشیب و فراز میں اپنے بل بوتے پہ چلنا سکھاتا ہے۔
- ماں اپنے تجربات سے سکھاتی ہے جبکہ باپ نئے تجربات کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔
- ماں کی محبت کا اندازہ دنیا میں آنکھ کھولتے ہی ہو جاتا ہے جبکہ باپ کی محبت کا اندازہ خود باپ بننے کے بعد ہوتا ہے۔

/darsequran1

علم و عمل کے کوہ ہمالیہ، حجۃ اللہ، مفکر اسلام، متکلم اسلام، حامی توحید و سنت، ماحی شرک وبدعت، مناظر اہل حق، داعی کتاب وسنت، مدرس، محقق، محدث، لسان، ادیب وخطیب، استاذی المکرم علامہ ڈاکٹر خالد محمود رمضان المبارک کے درمیانی عشرہ کی آخری رات ۱۴ مئی ۲۰۲۰ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

علامہ خالد محمود رحمۃ اللہ علیہ سے میری پہلے پہل شناسائی جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام مدنی محلہ جہلم میں ہوئی، جہاں میں ۱۹۸۴ سے ۱۹۸۸ء تک زیر تعلیم رہا، جامعہ حنفیہ کے سالانہ جلسہ میں ملک بھر سے اکابرینِ ملت اور اساطینِ امت تشریف لاتے اور اپنے علمی دلائل و حجج سے بھرے خطابات سے سامعین کو نوازتے تھے۔

علامہ خالد محمود رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت یا تو جامعہ حنفیہ میں ہوئی یا پھر ضلع چکوال کے ایک گاؤں بھیں میں ہوئی، جہاں قائد اہل سنت حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہ کی زیر نگرانی سالانی عظیم الشان سنی کانفرنس ہوا کرتی تھی اور اب بھی بڑے تزک واحتشام کے ساتھ ہو رہی ہے، علامہ رحمۃ اللہ علیہ کو ان کانفرنسوں میں خصوصی بیانات دیے جاتے تھے۔

پھر عصر طالب علمی ہی میں حضرت کی ایک بار زیارت گجرات شہر کے مدرسہ حیات النبی ﷺ میں ہوئی تھی، حضرت بیان کے لیے تشریف لائے تھے اور ہم جہلم سے یہاں جلسہ سننے پہنچے تھے، یہاں میں نے حضرت سے شاگردی کا پہلا شرف اس وقت حاصل کیا جب میں نے ایک کاغذ پر کچھ اردو عبارات لکھ رکھی تھیں اور علامہ صاحب سے میں نے ان عبارات کا اردو میں ترجمہ کروایا تھا۔

۱۹۸۸ء میں بندہ لاہور آگیا تھا، اسی دوران مجھے پتا چلا کہ علامہ رحمۃ اللہ علیہ یہاں سنت نگر میں اقامت پذیر ہیں، میں اپنا وقت نکال کر علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آتا تھا، علامہ صاحب کو اسی سنت نگر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں میں نے مصروف مطالعہ پایا، آنے والوں کے مختلف سوالات کے تشفی بخش جوابات دیتے تھے، یہاں ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ علامہ رحمۃ اللہ علیہ وقت کے ولی اور دُرویش انسان ہیں، ہر طرف کتابوں کے انبار دکھائی دیتے تھے، کسی دوسرے کمرے میں علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی کتابیں رکھی ہوئی تھیں جو طلب پر طالب کو پیش کی جاتی تھیں۔

علامہ رحمۃ اللہ علیہ طالب علموں میں کتاب کی محبت وعشق پیدا کرنے کے لیے کسی کو کتاب مفت میں نہیں دیتے تھے، وہ کہتے تھے کہ مفت کی چیز بے قدری ہوتی ہے، اس لیے کتابوں کا معمولی سا ہدیہ وصول کرتا ہوں، مجھے بھی حضرت نے اپنے دست مبارک سے ایک بار کچھ کتابیں دی تھیں جن پر میرے نام سے پہلے انہوں نے علامہ فہامہ لکھا تھا، جس کی لذت ایک عرصہ تک میں محسوس کرتا رہا، مجھ سے حضرت نے پچاس روپے وصول فرمائے اور ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا کہ آئندہ حسب استطاعت اور حسب سہولت ان کے بقایاجات ادا کرتے رہیں، اس طرح تعاونو علی البر پر عمل ہوگا اور کتاب کی اہمیت اور افادیت کا بھی احساس رہے گا، آج بھی شاید وہ کتابیں میری

لائبریری میں موجود ہیں۔

ایک بار طالب علمی کے زمانہ میں میں لاہور اس وقت آیا تھا جب یہاں نیلا گنبد میں بڑے بڑے علماء کرام نے ایک جلسہ منعقد کیا تھا،اس جلسہ میں علامہ عبدالستار تونسویؒ،مولانا عبداللطیف جہلمیؒ،مولانا حق نواز شہیدؒ،علامہ عطاء المحسن بخاری جیسے بڑے حضرات اس عظیم الشان جلسہ کی رونق تھے،علامہ خالد محمود رحمۃ اللہ علیہ اس خوبصورت جلسہ میں نقابت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

۱۹۹۰ء میں دورہ حدیث شریف جامعہ اشرفیہ لاہور سے کیا،اس کے بعد میں شالیمار باغ کے سایہ میں ایک مسجد ابوذر غفاری میں امامت کرنے لگ گیا،کچھ عرصہ بعد یہاں خطابت بھی شروع کردی،دورانِ خطابت میں نے ایک بار علامہ رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! آپ نے میری مسجد کے لیے کوئی جمعہ دینا ہے،چنانچہ حضرت نے کمال مہربانی اور شفقت سے مجھے وقت دیا،پھر میں سنت نگر سے حضرت کو اپنے ہمراہ رکشہ پر بٹھا کر لایا،حضرت نے کوئی آدھ گھنٹہ یہاں بیان فرمایا،سبحان اللہ کیا علمی سوغات تھیں،کیا علمی لعل و گوہر تھے،انسانی عقل دھنگ رہ جاتی ہے۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم امام السلاطین ڈاکٹر عبدالقادر آزاد مرحوم سابق خطیب شاہی مسجد لاہور کے ڈیرے پر پہنچے،جہاں ڈاکٹر آزاد رحمۃ اللہ علیہ بھی شاہی مسجد میں خطبہ جمعہ سے فارغ ہو کر اپنے مہمان خانے میں اپنے نمازیوں،عقیدت مندوں اور حب داروں کے جھرمٹ میں محو تکلم تھے،ہماری آمد پر حضرت ڈاکٹر آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے تپاک سے استقبال کیا اور اپنی شایانِ شان ہماری تواضع کی،مولانا آزاد وسیع الظرف اور کشادہ دستر خوان رکھنے والے علماء میں سے ایک تھے،عصر کی نماز تک ہم مولانا آزاد کے پاس بیٹھے رہے،مولانا آزاد بہت دیر تک دنیا بھر کے مسائل

پر گفتگو کرتے رہے،اس دوران میں نے مولانا آزاد سے ایک گلہ کیا کہ آپ نے ملکہ ترنم نور جہاں کے چہلم میں شرکت فرما کر اچھا پیغام نہیں دیا،تو مولانا آزاد نے فرمایا کہ مولانا حدوٹی! اگر میں اس چہلم میں شرکت نہ کرتا تو دس ہزار لوگ رافضی بن جاتے

پھر ایک وہ شاندار،خوبصورت اور یادگار موقع آیا جب میں نے حضرت علامہ سے عرض کیا کہ حضرت! میں نے امیر عزیمت مولانا حق نواز شہید کی سوانح عمری لکھی ہے؟اس پر آپ مقدمہ تحریر کریں تاکہ میری کتاب کو استنادی حیثیت مل جائے؟حضرت علامہ صاحب نے پہلا سوال یہ داغا کہ تم اس سوال کا جواب دو کہ حق نواز شہید کی شہادت مظلومانہ تھی یا مجاہدانہ؟تو میں نے جواب دینے کی بجائے اس سوال پر غور شروع کر دیا۔

پھر ایک دن حضرت نے مجھے فرمایا کہ اس طرح کرتے ہیں کہ ہم پر سکون ماحول میں چلتے ہیں،امامیہ کالونی جامعہ ملیہ میں نے تعمیر کیا ہے،تم چل کر اسے بھی دیکھ لو اور وہاں دو تین دن رہ کر یہ کام وہاں بیٹھ کر کریں گے،میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایسا کرنے کی ہامی بھر لی۔

چنانچہ ایک دن ایسا آیا کہ حضرت نے اپنے ایک مرید خاص سے کہا کہ وہاں کھانے پینے کا انتظام نہیں ہے،تو اس طرح کرتے ہیں کہ کچھ خشک سی چیز تیار کر کے ساتھ لے چلتے ہیں اور اس پر گزارا کر لیں گے،چنانچہ مرید خاص نے کریلوں میں قیمہ بھر کر اوپر سے سلائی کروائی اور کریلے توشہ دان میں رکھ لیے اور یوں ہم چند لوگ امامیہ کالونی کے جامعہ ملیہ کی طرف روانہ ہو گئے،جہاں ہم تین دن تک قیام پذیر رہے اور وہاں حضرت نے میری لکھی ہوئی کتاب امیر عزیمت مولانا حق نواز شہید بہت سے مقامات سے دیکھی اور عش عش کرتے رہے،بہت خوش ہوئے،داد دی

اور پھر اس کتاب پر آپ نے تاریخی مقدمہ تحریر فرما کر میری حوصلہ افزائی کی، ان کا تحریر کردہ مقدمہ میری کتاب تاریخ عزیمت کی پہلی جلد میں موجود ہے، جو شاید کسی تفصیلی تحریر میں مکمل نقل کروں۔

پھر ایک موقع پر حضرت سے اس وقت میں نے بات کی جب آپ مشرف کے زمانہ میں شرعی عدالت کے جج مقرر ہوئے، ان سے پہلے شیخ الاسلام مولانا مفتی تقی عثمانی بوجوہ شرعی عدالت کے جج کے منصب سے سبکدوش ہو گئے تھے، علامہ مرحوم نے شرعی عدالت میں سود کے بارے میں قائم رٹ کے بارے میں کہا کہ اس پر نظر ثانی کی جائے، میں نے ان پر اعتراض کر دیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو علامہ صاحب نے مجھے صیانۃ المسلمین لاہور کے دفتر میں مولانا مفتی وکیل احمد شیر وانیؒ کی موجودگی میں اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں اس پٹیشن کو نظر ثانی کے لیے نہ بھیجتا تو مشرف اسے مکمل طور پر اڑا کر رکھ دیتا۔

علامہ خالد محمود واقعتاً ایک نابغہ روزگار انسان تھے، وہ چلتے پھرتے کتب خانہ تھے، انہیں بڑی بڑی کتابوں کی عربی عبارات زبانی یاد تھیں، ان کا اسلوب نگارش اور طرز تکلم انتہائی سادگی کے ساتھ جاذبیت رکھتا تھا، وہ تصنع اور مسجع مقفیٰ عبارات کی بجائے سہل اسلوب میں بات کرنے کے عادی تھے، وہ ایک سوال لوگوں کو سمجھانا چاہتے تو اس پر بھی اچھی طرح بات کرتے تھے تاآنکہ وہ سامعین کے دل ودماغ میں نقش کالحجر ہو جاتی تھی۔

علامہ خالد محمود رحمۃ اللہ علیہ دیار غیر میں بیمار ہوئے، ایک دن چارپائی سے اٹھتے ہوئے فرش پر گر پڑے، ٹانگ فریکچر ہو گئی، پھر جانبر نہ ہو سکے، ہسپتال میں داخل کروائے گئے، ہسپتال سے رپورٹ میں یہ بتایا گیا کہ وہ کرونا کا شکار ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

میرے پیر و مرشد، عارفی وقت، شیخ العرب والعجم حکیم اختر نوراللہ مرقدہ کے معتمدِ خاص اور مجازِ بیعت خلیفہ اجل حضرت الشاہ ڈاکٹر عبدالمقیم صاحب اپنی عمر ناپائیدار کی ستاسی بہاریں دیکھنے کے بعد ۱۳ جون کی شام کو خالق حقیقی سے جا ملے، اناللہ واناالیہ راجعون

میرے حضرت کچھ عرصہ سے بیمار تھے، پیرانہ سالی اور جسمانی کمزوری کے باعث اب کام کی رفتار وہ نہ رہی تھی جو چند ماہ پہلے تک تھی، جب تک صحت اجازت دیتی رہی تب تک باقاعدگی سے انجمن احیاء السنہ اور یادگار خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں بزرگوں کی طرف سے لگائی گئی ڈیوٹی کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، ہلکی پھلکی بیماری اور طبیعت کی ناسازی کے باعث کبھی خانقاہ میں حاضری موقوف نہیں فرمائی۔

ہمارے حضرت فنافی الشیخ تھے، وہ اپنے شیخ طریقت حکیم اختر نوراللہ مرقدہ کے عاشق ودیوانے تھے، حضرت حکیم صاحب کی بے شمار کتب انتہائی چاہت اور خطیر رقم صرف کرکے شائع کرتے اور اپنے مرشد سے ڈھیروں دعائیں لیتے تھے، وہ اپنے مرشد کے مزاج شناس تھے، حضرت حکیم اختر صاحب کے مواعظ وارشادات بہترین انداز میں زیور طباعت سے آراستہ کرنے کے بعد اندرون اور بیرون ملک تقسیم کرواتے تھے، اللہ یہ سارا سلسلہ ہمارے حضرت کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، تفصیلی مضامین الگ سے ہم المظہر کے خصوصی شمارے میں پیش کریں گے۔ (محمود الرشید)